جلد ۴۴	ماہ شوال المکرم ۱۳۵۸ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۳۹ء	عدد ۶

مضامین

شذرات

خدا کا شکر ہے کہ دار العلوم ندوۃ العلماء کی طرف قوم کی توجہ پھر منعطف ہو رہی ہے، شوال میں طلبہ کے داخلہ کی درخواستیں بھی غیر معمولی آئیں، لیکن مالی حالت کی مجبوری سے ۵۴ طالب علموں کے وظائف کی درخواستوں میں سے صرف بارہ طالب علموں کو لیا جا سکا، بہت سے ایسے غریب طالب علموں کی درخواستیں تھیں جن کو نامنظور کرتے ہوئے کارکنوں کو سخت صدمہ ہوا، مگر افسوس کہ چادر سے زیادہ پاؤں پھیلا کر بھی وہ ان کی مدد نہ کر سکے، یعنی ندوہ کے پاس صرف ۳۰ طالب علموں کی گنجائش تھی اور اس وقت اس سے دونے کا بوجھ اس نے اٹھایا، اور درخواستوں کا سلسلہ ان سطروں کے لکھتے وقت تک جاری ہے، ایک طالبعلم پر سات روپیہ ماہوار کا خرچ ہے،

ہم میں اہل وسعت تو اپنے بچوں کو عربی نہیں پڑھاتے، عربی پڑھنے والے زیادہ تر غریب والدین کے بچے ہوتے ہیں، جو اپنا خرچ خود پورا نہیں کر سکتے، کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ اس ضروری کام میں اہل ثروت اپنی جیبوں سے اور غریب اپنے جگر گوشوں سے مدد کریں اور اس طرح علم دین کی تعلیم و تعلم کا فرض باہمی تعاون سے انجام پائے،

الندوہ جس نے ۱۹۰۳ء سے لے کر ۱۹۰۹ء تک علمی تعلیمی اور مذہبی خدمات مولانا شبلی اور مولانا حبیب الرحمان خاں شیروانی کی ادارت میں بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیئے، اور آج کے معارف کے چلانے والے اسی کے مکتب کے پڑھے ہوئے ہیں، اب کامل تیس برس کے بعد پھر اس کو نکالنے کا سامان کیا جا رہا ہے

علاوہ دوسرے علمی، تعلیمی، تعمیری، اور اصلاحی مقاصد کے خود ندوۃ العلماء کی آواز کو جو سالہا سال سے دب چکی ہے اور جس کی اب بھی ضرورت اتنی ہی ہے، دوبارہ بلند کرنے کا خیال ہے، اور علمائے کرام کو دوبارہ ان کے بھولے ہوئے فریضہ کو یاد دلانے کا عزم ہے، ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ، ضخامت ۲ جز قیمت عار ہو گی، پتہ:- منیجر الندوہ بادشاہ باغ لکھنؤ،

مولانا شبلی مرحوم کے اردو دیوان کا ایک نیا اڈیشن جو ان کے ہر قسم کے اردو قصیدوں، قطعوں، مثنویوں اور اخلاقی و سیاسی نظموں پر مشتمل ہے اس وقت چھپ رہا ہے، اس کے شروع میں مولانا کی اردو شاعری پر ایک تبصرہ ہو گا، تقطیع موزوں رکھی گئی اور کاغذ بھی دبیز لگایا گیا ہے، ہر حوالہ طلب نظم کے حوالے بھی ہر نظم کے ساتھ اس کی تمہیدیں لکھ دیئے گئے ہیں، ضرورت ہے کہ یہ اڈیشن ہر مسلمان نوجوان کے ہاتھوں میں رہے،

ہندوستانی کی تجویز کانگریس نے پیش کی تھی، اور زبان کے جھگڑے میں اس کا یہ فیصلہ متفقہ ہے، مگر کیا عجیب بات ہے کہ جب صوبہ بہار کی تعلیمی وزارت نے اس خیال کو عمل میں لانے کی کوشش شروع کی تو اس کی مخالفت پنڈت مدن موہن مالوی سے لیکر جنتا سبھا پٹنہ کے ممبروں تک نے شروع کر دی، ہندوستانی کا بت بنا کر اس کی ہولی جلائی گئی، اس زبان میں چھپے ہوئے رسالوں اور کتابوں کا بائیکاٹ اور اس کی وجہ سے دھرم ناس ہونے کا ڈر بتایا جانے لگا، اور بات اتنی سی ہے کہ کسی نوشق نے راجہ دسرت کو بادشاہ اور اجودھیا کی پرجا کو رعیت لکھ دیا، یہ ہے ہمارے دیس کے بھگتوں کی دیس پوجا اور اسکے ذریعہ سے ملک کی آزادی کا خیال،

مسلمانوں کو تنگ خیال سمجھنے والے ہندو دوست ذرا اپنے گریبان میں منھ ڈالیں اور صرف ایک زبان ہی کے معاملہ میں اپنی دورنگی چال ملاحظہ فرمائیں کہ جب کانگریس کے چوپال میں بیٹھیں تو ہندوستانی کا گیت گائیں اور جب کونسل کی اسپیکری اور تعلیمی وزارت کی کرسیوں پر بیٹھیں تو اردو اور ہندی کہہ کر فی صدی آبادی کے حساب سے کتابوں کے دام بانٹیں اور دیہاتی لائبریریاں بنائیں، اور گھر جا کر نجی کے طور پر سنسکرتی ہندی کے بڑھانے

اور اس کو ملک کی بولی ٹھہرانے کی تجویزیں سوچیں، اور پرزور تقریریں کریں،

کہئے یہ حکم رہے، کہئے وہ ارشاد رہے

ہمارے مخدوم مولوی عبد الحق صاحب اردو کی جو جوانمردانہ خدمت کر رہے ہیں وہ اردو کے ہر حامی کے شکریہ کی مستحق ہے، دسمبر کے آخر میں وہ دلی میں انجمن ترقی اردو کا ایک عام اجلاس کر رہے ہیں جس میں زبان کی ترقی کے ہر مسئلہ پر گفتگو ہوگی، ضرورت ہے کہ ہم اس وقت صرف کچھ کہنے کے لئے نہیں بلکہ کچھ کرنے کے لئے اٹھے ہوں، اور زبان کی خدمت صرف زبان سے نہیں بلکہ عمل سے بھی کرکے دکھائیں،

انھی دنوں میں کلکتہ میں مسلم تعلیمی کانفرنس کے اجلاس ہونگے، ہم کو امید ہے کہ بنگال کے مسلمان اس کانفرنس میں سیاست کی خاطر نہیں، بلکہ تعلیم کی خاطر کچھ کریں، اور بنگال کے مسلمانوں کے سامنے ان کی علمی، تعلیمی، تمدنی اور ادبی مستقبل کی ایسی تجویزیں پیش کریں، جن سے بنگال ہندوستان کا ٹکڑا بن جائے، کیا عجیب بات ہے کہ قریب قریب مسلمانوں کی آدھی تعداد بنگال میں آباد ہے اور وہ زبان کی بیگانگی کے سبب سے ہندوستان کی ساری اسلامی تحریکوں سے ایک لخت بے خبر ہے، کیا یہ سوچنے کی بات نہیں،

سیرۃ النبیؐ کی چھٹی جلد کی چھوٹی تقطیع کی مانگ ہو رہی ہے، مگر لڑائی نے کاغذ کو اتنا گراں کر دیا ہے کہ کوئی بڑی کتاب کاغذ کے کافی ذخیرہ کے بغیر چھپنی مشکل ہو، معلوم نہیں ایک کاغذ پر کتنے جز چھپنے کے بعد وہ کاغذ پھر نہ مل سکے، اس لئے ہم کاغذیوں سے خط و کتابت کر رہے ہیں، جس وقت کاغذ کی طرف سے اطمینان ہوا وہ چھپنی شروع ہو جائیگی،

بعض احباب کی تحریک ہو کہ دار المصنفین کی پچیس سال کے کارناموں کی ایک مختصر تاریخ مرتب کر دیجائے جس میں اسکے تخیل، نظام، قیام، اور ہر رفیق کے مختصر حالات، اور اس کی تصانیف کے نام، اور پھر فن وار دار المصنفین کے مطبوعات، اور اس کے آیندہ کاموں کا پروگرام ہو،

مقالات

"تذکرۃ السامع والمتکلم"

اور

فنِ تعلیم پر ایک نظر

از

مولینا ابو عبد اللہ محمد بن یوسف السورتی

"دائرۃ المعارف العثمانیہ" ہندوستان ہی نہیں، دنیاے اسلام میں اپنی قسم کا واحد علمی ادارہ ہے، جو متقدمین کی تالیفات کی اشاعت، اور انھیں بکفایت اہلِ علم کے ہاتھوں پہونچانے کے لئے قائم کیا گیا ہو، اُس نے ۱۳۵۱ھ میں ایک اسکیم تیار کی تھی، جس میں کم و بیش دس سال کے لئے کتبِ نادرہ کا انتخاب کر لیا تھا، ضرورت ہو کہ اراکینِ دائرہ اس اسکیم کی تکمیل مقدم و اہم خیال کریں، اور جہاں تک ممکن ہو نئی کتابوں کی طرف توجہ نہ کریں،

۱۳۵۳ھ میں دائرہ نے کتاب "تذکرۃ السامع والمتکلم" شائع کی جو اگرچہ دہ سالہ اسکیم میں نہیں ہے، مگر اپنے موضوع کے اعتبار سے دلچسپ اور مفید ہے اور اس کے وہ حواشی و شروح بھی قابلِ ذکر ہیں، جنھیں دائرہ نے بڑی محنت و جانفشانی سے تیار کیا ہے، اگر ان کو شرح کی شکل میں کر دیا جاتا تو زیادہ مفید ہوتا،

موضوعِ کتاب | کتاب "تذکرۃ السامع والمتکلم" فنِ تعلیم پر کم و بیش سوا دو سو صفحوں کی کتاب ہو،

مسلمانوں نے اپنے عروج اور علمی کمال کے زمانہ میں ہر ایک موضوع پر کافی بحث و تنقیح اور اعلی سے اعلی تحقیق کی ہے، علوم نقل و عقل صنعت و حرفت علمی و عملی ہر پہلو پر بسط و توضیح سے کام کیا ہے، ہر فن کے اہم ابواب و فصول پر خاص خاص تحقیقاتوں کا بے بہا خزانہ خلف کے لئے چھوڑا ہی،

یہ ہماری غفلت کہئے یا قومی ادبار و انحطاط کا نتیجہ، کہ وہ علمی خزانے زمانہ کے ہاتھوں تلف ہو گئے یا ہمارے یہاں سے دوسرون کے یہاں پہونچ گئے، اور جو موجود ہیں، انکی طرف ہماری توجہ و نظر نہیں، نہ ہمیں اوسکی کوئی قدر ہے،

یورپ نے اپنی ضرورت کے مطابق تاریخ جغرافیہ، سیاسیات وغیرہ کے نوادر شائع کئے، اور اُسے اپنی خاص مصلحت کی بنا پر ایک حد تک پہونچایا، مگر ہمارے یہاں نہ اہل علم کی کوئی ایسی جماعت ہے اور نہ کوئی ادارہ جو اس بے بہا خزانہ کی قدر و قیمت پہچانتا، اور اس کی اشاعت سے اسے نشأۃ ثانیہ بخشتا، ایک دائرۃ المعارف ہی جس نے اس فرض کا ایک حصہ اپنے ذمہ لیا، اور وہ اس کیلئے کام کر رہا ہے،

یہ عام خیال جو زیادہ تر انگریزی خواں طبقہ میں سرایت کیا گیا ہے، کہ مسلمانون نے اپنے ترقی کے زمانہ میں کوئی علمی کام نہیں کیا، بالکل غلط اور اصلیت سے دور اور محض ہمارے دشمنوں کی دسیسہ کاری اور ابلہ فریبی ہی،

تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کے علوم و فنون میں مسلمان کئی صدیوں تک استاد و امام کی حیثیت رکھتے تھے، انھون نے عرصۂ دراز تک علمی امانت کی تنہا حفاظت و نگہداشت ہی نہیں کی، بلکہ اس کو ترقی کے اعلی مدارج تک پہونچایا، اور تکمیل و تہذیب کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا اگر علما و فضلاء علم و فن کی خدمت کرتے تھے تو سلاطین و امراء انکی کفالت و خدمت باعث سعادت سمجھتے تھے، اس زمانہ کا علمی شغف، علو ہمت، ذوق تحقیق قابل قدر ہی، مسلمانون نے دوسروں سے جو کچھ لیا، اس کو بہت

زیادہ تہذیب و اضافہ، تصحیح و تنقیح سے علمی تکمیل تک پہونچایا، کوئی علم و فن ایسا نہیں جس میں انھون نے اجتہاد و تحقیق سے کام نہ لیا ہو اور کوئی غلطی قدما کی ایسی نہیں، جس پر ان کی تنقید نہ موجود ہو، آج یورپ بہت سی چیزوں میں انہی کا خوشہ چیں ہے، مگر ہمارے نوجوانوں کو اس کا احساس نہیں، وہ اپنے اسلاف کے کارناموں سے اس قدر دور، غافل اور ناواقف ہیں، کہ اجانب کی پرستش کرتے ہوئے تھکے جاتے ہیں، مگر اپنوں کا حق ادا نہیں کرتے، اور کمال تحقیق یہ سمجھتے ہیں، کہ کسی یورپین زبان سے کوئی مضمون نقل کر دیا جائے، اور خود اپنے گھر کے خزانوں کی ان کو خبر نہیں،

مصر نے احادیث کے مضامین کی ایک فہرست "مفتاح کنوز السنۃ" کے نام سے ترجمہ کرکے شائع کی، قرآن مجید کے مضامین کا ایک خاکہ "تفصیل آیات القرآن" کے نام سے ترجمہ کرکے شائع کیا، یہ کام اچھا ہے، مگر یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ہم اپنی چیزوں کے لئے بھی دوسرون کے دست نگر ہیں، مستشرقین کچھ نہ کچھ کام کرتے ہیں، مگر علوم اسلامیہ کے بارہ میں ان کی معلومات بہت ناقص ہیں، ان کی تحقیقات کا دار و مدار سطحیات پر ہوتا ہے، ان کی غلطیاں ان کی صحت سے زیادہ ہوتی ہیں، اس لئے ان کے فوائد کیساتھ خطرات بھی زیادہ ہیں، جو لوگ سنت اور مطالب قرآن کریم سے ناواقف اور نابلد ہوں انکا ان کی فہرست بنانا ایک علمی تفریح سے زیادہ نہیں، ضرورت تھی کہ ان کی فہرست کی پوری تنقید کیجاتی، اور پورے غور و تدبر سے کامل فہرستیں تیار کرکے شائع کیجاتیں، مگر ہم اسی پر قناعت کر چکے، جو یورپ نے ہمیں دیا،

ایک زمانہ ایسا بھی تھا، کہ لوگ یورپ کی تحقیقات کو وحی آسمانی کی طرح حقیقت اور صحت کا سرچشمہ تصور کیا کرتے تھے، لیکن اب یہ حقیقت آشکارا ہو چکی، کہ مغرب کا بنایا ہوا کھیل ناقابل اعتبار اور زیادہ سے زیادہ نقد و نظر کا محتاج ہوتا ہے، اسکی تحقیقات میں تعصب، غلط فہمی، جہالت، ہر طرح کی خامیاں ہوتی ہیں، یہ مسلمانوں کا فرض تھا، کہ وہ اسکی غلطیوں کی اصلاح کرتے، باطل اور لغو

پروپگنڈے کو روکتے، اسکی علمی تحقیقات اور تاریخی معلومات کا پردہ چاک کرتے، مگر اس کے لئے ایک مجمع علمی کی ضرورت تھی، جس میں اساطین علم و ارباب تحقیق شامل ہوتے، اور ماہرین السنہ کے ساتھ مل کر یہ فرض انجام دیتے، تاآنکہ یورپ اپنے خیالات پر نظر ثانی کرنے کے لئے مجبور ہو جاتا اور اسکے غلط تخیلات و نظریات ناقابلِ اعتبار ٹھہرتے،

مقصود یہ ہو کہ مسلمانوں نے اپنے دور ترقی میں ہر ایک علم و فن اور ہر قسم کی تحقیقات پر کافی کام کیا اور خلف کے لئے بہت کچھ ذخیرہ چھوڑ گئے، گو اس زمانہ میں طباعت اور نشر و اشاعت اور سفر و حمل کی سہولت نہ تھی، مگر ان کی علمی قدر دانی علو ہمت اور وفور شوق نے یہ تمام مشکلات آسان کر دیئے تھے، باوجود ان مشکلات کے تصنیف و تالیف تحقیق و تنقید اور اسکی نشر و اشاعت کا سلسلہ جاری تھا، مشرق میں مغرب کے اہل علم آتے تھے، حج و زیارت کے سلسلے میں بہت کچھ مشکلات حل کیجاتی تھیں، جگہ جگہ ایسے آدمی بطور ایجنٹ مقرر تھے، جن کے ذریعہ کتاب مؤلف کے ہاتھ سے نکلتے ہی تمام علمی مرکزوں میں بہت جلد پہونچ جاتی تھی، باوجود ہزاروں میل کی مسافت کے علم کی نشر و اشاعت کے لئے مشرق و مغرب کا سلسلہ اتنا ملا ہوا تھا، کہ اس آسانی اور سہولت کے دور میں بھی اسکی مثال نہیں ملتی خطیب بغدادی متوفی ۴۶۳ھ بغداد میں بیٹھے ہوئے ابن حزم الاندلسی المتوفی ۴۵۶ھ کے علوم سے استفادہ کرتے ہیں، اور اپنی تاریخ بغداد میں ان کے حوالے پیش کرتے ہیں، خود ابن حزم جو کبھی مشرق نہیں آئے، قرطبہ میں بیٹھے ہوئے مصر و بادیہ عرب کے حالات انساب و دیگر معلومات خط و کتابت کے ذریعہ سے حاصل کرتے ہیں، اور اس کا ذکر اپنی کتابوں میں کرتے ہیں،

اس زمانہ میں طباعت کے قائم مقام فن وراقۃ تھا، وہ زمانہ اس کے عروج کا تھا، جہاں کوئی تالیف تیار ہوئی، اس کے سیکڑوں نسخے ایک سے ایک اعلی نہایت اہتمام و تصحیح سے تیار ہو کر بازار میں فروخت ہونے لگے، تاجر کتب وراق کہلاتے تھے، بہت سے باکمال ایسے گذرے جنھوں نے اسی

وراقۃ کے سلسلہ میں علم و تالیفات کی بڑی خدمت انجام دی، مثلاً ابن الندیم جس نے اپنے زمانہ تک کے علوم و فنون کی تالیفات اور مؤلفین کیلئے کتاب الفہرست بطور یادگار چھوڑی، !

جس طرح آجکل اخبار و رسائل کے ذریعہ متفرق خیالات، سیاسی و مذہبی افکار کی نشر و اشاعت ہوتی ہے، اور اس میں یورپ کو ید طولی حاصل ہے، اسی طرح گذشتہ زمانہ میں خاص خاص جماعتیں، امراء و خلفاء اپنے خیالات، سیاسیات اور مذہبیات کی اشاعت کیلئے مختصر رسائل اور کتابوں سے کام لیا کرتے تھے، ابو العیناء، ابن الراوندی، الجاحظ اور اس قسم کے بہت سے مؤلفین ہیں جو سیاست وقت کی خدمت کرتے تھے، اور ارکان سلطنت ان کی انشاء پردازی اور سحر طرازی سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے تھے، اور ان کے رسائل اخبار و مجلات کی طرح شائع کئے جاتے تھے،

فن تعلیم اس فن پر اصولاً و فروعاً بہت کچھ لکھا گیا، اسلام عقائد و اعمال کے ساتھ علم بھی لایا، اور اس نے سب سے پہلے تمام دنیا کو ہر قسم کی ذہنی غلامی سے آزاد کر کے صحیح علم کا شیدا بنایا، اسلام کا مدرسہ محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے قائم ہوا، آپ اس درسگاہ کے پہلے معلم تھے، آپ کے مدرسہ میں صحابہ کرام بالخصوص اصحاب صفہ علمی جماعت تھی، جن کی پاک زندگی علم و عمل کے لئے وقف تھی، انھیں آل و اولاد کسب معاش وغیرہ کسی چیز کی فکر نہ تھی، صحابہ کرام بھی اپنی اپنی ہمت کے مطابق علم کے لئے فرصت نکال کر حاضر ہوتے تھے، بعضے ایک دن اپنا کام کرتے، اور ایک دن تحصیل علم کرتے، کتب حدیث وسیر اور اصحاب صفہ کے لئے خاص تاریخیں اس امر کی شاہد ہیں، کہ علم سے ان کا شغف اعلی درجہ کا تھا، بدر کے کفار جب قید ہو کر آئے، تو علم ہی کے لئے چند آدمیوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دینا ان کا فدیہ قرار دیا گیا، علم ہی کی شان ہو کہ تعلیم قرآن کو مہر نکاح کر دیا گیا، اور "اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْقُرْآنِ اَقْوَامًا وَیَضَعُ بِہٖ آخَرِیْنَ" کا اعلان ہوا، جس نے علم قرآن حاصل کیا، وہ عزت پائے گا، اور جو اس سے جاہل رہا، وہ ذلیل و خوار ہو جائے گا (

صحابۂ کرام کو جب جنگ سے ذرا اطمینان ہوا تو انھون نے فوراً تعلیم کا سلسلہ قائم کردیا، چنانچہ حضرت امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے عام تعلیم کا اعلان فرمایا، اور جگہ جگہ معلمین مقرر کرکے بدوی اور شہری آبادی میں تعلیم کی اشاعت کی، یہ گویا جبری تعلیم کا طریقہ تھا، کہ جنگلی پکڑ پکڑ کر لائے جاتے، اور کتابت و حرف شناسی سے آشنا کئے جاتے تھے، اس طرح امۃ اسلامیہ کا ہر ایک فرد قلیل مدت میں علم و تعلم سے تعلق قائم کرلیتا تھا، متفرق مقامات پر خاص معلمین مقرر کئے گئے، مثلاً حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ کوفہ میں، ابو موسیٰ اشعریؓ بصرہ میں، عبادہ بن صامتؓ اور ابو الدرداؓ شام میں،

پھر جسے علم سے سیراب ہونے کا شوق ہوتا، وہ مدینہ کا رُخ کرتا، اور وہان جلیل القدر صحابہ سے استفادہ کرکے اپنی پیاس بجھاتا،

پہلی صدی ہجری تک یہی رنگ رہا، اور تعلیم صحیفہ کے بجائے سینہ بسینہ ہوتی رہی، خاص خاص اشخاص کی وجہ سے مخصوص مقامات علمی مرکز بن گئے، مثلاً حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی ذات سے مکہ مکرمہ اور طائف، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ، اور حضرت عائشہ صدیقہ وغیرہما کی ذات سے مدینہ منورہ وغیرہ علم کے مرکز تھے، پھر رفتہ رفتہ اس میں ترقی ہوتی گئی، تا آنکہ مدارس کی بنیاد پڑی، ان کی ضروریات کیلئے تالیفات، تراجم، اور اس ضرورت کی تکمیل کیلئے کاغذ سازی، کتابوں کی نقل و اشاعت کیلئے فن وراقہ پیدا ہوا، مدارس کے واسطے اصول و ضوابط، معلمین و متعلمین کے وظائف، "طبیب"، "معید"، "حفاظ" و قرا وغیرہ مقرر کئے گئے،

باقاعدہ مدرسہ کی عمارت کے بارہ میں سخت اختلاف ہے، کہ کس سنہ مین اسکی ابتدا ہوئی، مگر تیسری صدی یا اسکے کچھ بعد سے یہ سلسلہ جاری ہونا ہر طرح مسلم ہے، چھٹی اور ساتویں صدی اور اسکے مابعد مدارس کی تاریخ، ان کے مدرسین و طلبہ کے حالات میں متعدد کتابیں لکھی گئین جن کا بڑا حصہ آج مفقود ہے،

علامہ ابن خلدون نے اپنی مشہور تاریخ کے مقدمہ میں علوم و فنون، ان کی ضرورت، طرز تعلیم وغیرہ پر مفید اصولی بحث کی ہے، اور متفرق علوم و فنون کی اہم کتابوں کے بارہ میں جابجا اپنا اور اپنے اساتذہ کا خیال پیش کیا ہے، اس اعتبار سے ان کا مقدمہ آٹھویں صدی کے علمی حالات، اور کتب نصاب کا ایک خاکہ ہے، اس کے علاوہ علم کے فضائل، طریق تعلم و تعلیم پر اہل علم نے بہت کچھ تالیفات چھوڑی ہیں، جن میں سے موجودہ کتب کا معتد بہ حصہ ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں،

۱- **جامعُ بیان فضل العلم واھلہٖ**، حافظ المغرب ابن عبد البر الاندلسی المتوفی سنہ ۴۶۲ھ علم کے فضائل، ضرورتِ تعلیم، علماء کے اخلاق، طریقِ تعلم اور دوسرے اہم معلومات کا ذخیرہ ہے، یہ کتاب بطور مراسلہ تحریر کی گئی، اس کا مختصر مدت ہوئی شائع ہوچکا تھا، پھر اصل نسخہ بھی دو حصوں میں شائع ہوا، مگر مختصر زیادہ صحیح ہے،

۲- **فاتح العلوم للغزالی**، المتوفی سنہ ۵۰۵ھ یہ رسالہ مصر سے سنہ ۱۳۲۲ھ میں شائع ہوا، اس میں علم کی فضیلت، اس کی ضرورت، آدابِ تعلیم و تعلم، علوم کی تقسیم، وغیرہ مضامین ہیں، امام موصوف نے احیاء العلوم کی ابتدا میں بھی اس موضوع پر طویل بحث کی ہے،

۳- **تعلیم المتعلم**، برہان الدین الزرنوجی، مطبوع سنہ ۱۲۹۲ھ وغیرہ، یہ رسالہ تقریباً ساتویں صدی میں لکھا گیا، اس کی متفرق شرحیں بھی شائع ہوچکی ہیں، یہ بھی تعلیم و تعلم، اور آدابِ تعلیم پر حاوی ہے،

۴- **ارشاد القاصد الی اسنی المقاصد** ابن ساعد الاکفانی المتوفی سنہ ۷۴۹ھ یہ بے مثل کتاب گو مختصر ہے، لیکن تعلیم و تعلم اور نصابِ علم پر جامع و مفید ہے، اس کتاب میں ۶۰ علوم و فنون پر تبصرہ اور ان کی تقریباً ۴۰۰ کتابوں کا مختصر بیان ہے، گویا ہر ایک علم کی منتخب کتابوں کا ایک تذکرہ ہے، اس کے مؤلف "تذکرۃ السامع والمتکلم" کے معاصر ہیں، ان کی ایک دوسری کتاب جس کا ذکر علامہ سخاوی نے "الاعلان بالتوبیخ" میں خاص طور پر کیا ہے، "الدُّر النظیم فی آداب التعلم والتعلیم" ہے،

مگر اس کا نسخہ شائع نہیں ہوا،

۵- روضۃ العلماء زندویسی، ایک ضخیم کتاب علم و علماء کے متعلق تقریباً پانچویں صدی میں مرتب کی گئی، قلمی نسخے ہندوستان میں متعدد کتبخانوں میں موجود ہیں،

۶- "اللؤلؤ النظیم" شیخ زکریا انصاری کا مختصر رسالہ تعلیم و تعلم کی بابت غالباً شائع ہو چکا ہے میری نظر سے قلمی نسخہ گذرا ہے،

۷- المعید فی ادب المفید والمستفید" مختصر کتاب الدر النضید" تالیف الشیخ عبدالباسط ابن موسی العلموی المتوفی ۹۸۱ھ طبع دمشق ۱۳۴۹ھ،

یہ کتاب بھی "تذکرۃ السامع والمتکلم" کے اکثر مضامین پر حاوی ہے، اور جا بجا اس سے نقل و استفادہ کیا ہے، تعلم و تعلیم کے آداب وغیرہ پر بہت کچھ مسائل و فوائد اس میں ہیں،

تعلم و تعلیم اور اس کے متعلقات پر محدثین کے یہاں اصول حدیث میں نہایت اہم اور ضروری مباحث ہیں، خود حدیث کی کتابوں میں بھی "ابواب العلم" کے ذیل میں بہت سے مسائل ہیں، شرح و بسط کیلئے کتب ذیل خاص طور پر قابل مطالعہ ہیں،

(۱) المحدث الفاصل للرامهرمزی المتوفی حدود ۳۶۰ھ یہ اصول حدیث میں اولین کتاب شمار کیجاتی ہے، اس میں تعلم و تعلیم، تالیف و تصنیف، مقابلہ و تصحیح، طریقہ تعلیم کس عمر میں کونسی تعلیم حاصل کیجائے وغیرہ مباحث اور خاص ابواب پر مشتمل ہیں، یہ کتاب ابتک شائع نہیں ہوئی، قلمی نسخہ پیش نظر ہے،

(۲) کتاب الکفایہ فی علوم الروایہ، للخطیب البغدادی، المتوفی ۴۶۳ھ اس کا قلمی نسخہ پیش نظر تھا، یہ دائرہ کی دو سالہ اسکیم میں تھا، اور ۱۳۵۷ھ میں شائع ہو چکا،

(۳) کتاب الجامع فی آداب الراوی والسامع، للخطیب، اس کا قلمی نسخہ شام میں ہے،

یہ گویا "الکفایہ" کی تکمیل ہے،

۴- کتاب الالماع فی آداب السماع، قاضی عیاض بن موسی الیحصبی المتوفی ۵۴۴ھ بھی اسی قسم کی کتابوں میں شامل ہے، اس کے قلمی نسخے متعدد جگہ ہیں،

۵- مقدمہ ابن الصلاح، شرح مقدمہ، تدریب الراوی، الباعث الحثیث وغیرہ میں بھی یہ مباحث ہیں،

"تذکرۃ السامع والمتکلم" کے ابواب

مؤلف نے کتاب کو پانچ حصوں پر تقسیم کیا ہے،

۱- باب اول، علم اور علماء کے فضائل، اس میں آیات اور احادیث صحیحہ وغیرہ درج ہیں، صفحہ ۵ سے ۱۴ تک،

۲- باب دوم، عالم کے کیسے اخلاق ہونے چاہئیں، اس کی تین فصلیں ہیں، الف عالم اپنی ذات سے کیسا ہو، ب درس و تدریس کے وقت کیسا ہو، ج طلبہ کے ساتھ کیسا برتاؤ کرے، یہ باب ص۱۵ سے ص۶۶ تک ہے،

۳- باب سوم، طالب علم کو کیسا ہونا چاہئے، اسکی بھی تین فصلیں ہیں، الف خود طالب علم کیسا ہو، ب استاد کے ساتھ کیسے برتاؤ کرے، ج درس کے وقت اور رفقاء سے کیسا برتاؤ ہو، یہ باب ص۶۷ سے شروع ہو کر ص۱۲۳ پر ختم ہوتا ہے،

ان تینوں ابواب کے متعلق احیاء العلوم اور جامع بیان فضل العلم میں بہت زیادہ تفصیل سے ملیگی، اسی طرح فاتح العلوم میں بھی تمام احادیث کی تخریج کے لئے شرح احیاء العلوم اور المغنی عن حمل الاسفار حافظ زین الدین العراقی کی کافی ہے، جو احیاء العلوم کے ساتھ مصر میں شائع ہو چکی ہے، ابوبکر محمد بن الحسین الاجری المتوفی ۳۶۰ھ نے ایک مختصر رسالہ "اخلاق العلماء" کے نام سے لکھا ہے، جو ان مضامین پر حاوی ہے، یہ ۱۳۴۵ھ میں مصر سے شائع ہو چکا ہے، اس رسالہ

میں آجُرّی نے صـ۲۰ تک فضائل علم وعلما، لکھے ہیں، پھر صـ۲۹ پر کتاب کے تمام ضروری مطالب کی فہرست اس طرح تحریر کی ہے، "عالم کے مختلف حالات ہیں جن میں خاص خاص باتوں کا اسے خیال رکھنا چاہئے، طلبِ علم کے وقت، درس کے وقت، علم سے فارغ ہونے کے وقت، علمار کی مجلس میں تعلیم کے وقت، مناظرہ وافتار کے وقت متفرق حالات میں کن کن اخلاق واصول کا پابند ہونا چاہئے، اُمرار کی مجالس میں کیا کرے، ؟ کن لوگوں سے اختلاط وارتباط رکھے؟ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اُسے کیسا تعلق ہو، بندوں سے کس طرح پیش آئے، ؟" ان تمام باتوں پر ایک ایک کرکے پوری کتاب میں مفید بحث کی ہے،

علامہ ابن الاکفانی مؤلف "ارشادُ القاصدؔ" نے صـ۲۱ پر تعلم وتعلیم کے بارہ میں ۱۲ شرطیں لکھی ہیں جنھیں اس فن کی تمام ضروری باتوں کا خلاصہ سمجھنا چاہئے، ہم اس جگہ ان کی بحث کا مختصر خاکہ پیش کرتے ہیں، تاکہ یہ اندازہ ہوسکے، کہ مسلمانوں میں صحیح علمی مذاق پیدا کرنے کے واسطے کن اصولوں کی پابندی ضروری سمجھی جاتی تھی، جنھیں آج ہم نے پسِ پشت ڈال دیا، اور دوسرے ان سے متمتع ہو رہے ہیں،

(۱) علم وفضل حاصل کرنے کا خاص مقصد کسی فن میں کمال حاصل کرنا یا جس کے واسطے یہ فن مرتب ہوا ہے، اس میں کمال کا خیال ہونا چاہئے، محض مال وجاہ، دولت وترقی کے لئے آلہ کار نہ بنائے، کیونکہ علمی فضل وکمال صرف اسی صورت میں حاصل ہوسکتا ہے،

(۲) ہمیشہ اُسی علم وفن میں کوشش کرنی چاہیے، جس کی جانب طبعی رجحان ہو، کیونکہ نہ تمام لوگ عالم بن سکتے ہیں، نہ ہر ایک عالم تمام علوم وفنون میں کمال حاصل کرنے کی قابلیت رکھتا ہے،

(۳) جس علم وفن کی تعلیم حاصل کرنا مقصود ہو، پہلے اس کی حقیقت معلوم کرے، اس کی غرض وغایت اچھی طرح سے سمجھے، اور یہ معلوم کرے، کہ یہ علم کب اور کس طریقہ سے حاصل کرنا چاہئے،

(۴) جس فن کو سیکھے، پوری جانفشانی اور محنت سے سیکھے، اپنی طاقت کے مطابق اس کے مسائل ومشکلات حل کرے، جہانتک ہوسکے فن کے تمام مسائل پر عبور حاصل کرنے کی کوشش کرے،

(۵) ہر ایک فن کی بہترین تالیفات پڑھے، انہی کو اپنے مطالعہ میں رکھے، ہر ممکن ذریعہ سے ان سے استفادہ کرتا رہے، اس میں کسی طرح کی سُستی نہ کرے،

کتبِ علوم وفنون کی تقسیم، علوم وفنون کی تالیفات تین قسم کی ہیں، :-
(۱) مختصرات (۲) متوسطات (۳) مبسوطات،

مختصر وہ تالیف ہے، جس کے الفاظ کم اور مطالب زیادہ ہوں، انھیں تذکرہ (نوٹس) سمجھنا چاہئے، جس سے منتہی استفادہ کرسکتے ہیں، اگر مبتدی ذہین اور ذکی ہے تو وہ بھی مستفید ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے،

متوسط وہ تالیف ہے، جس کے الفاظ ومطالب برابر ہوں، اور جس میں فن کی ضروریات آسان طریقہ سے بیان کی گئی ہوں، اس سے ہر طبقہ کے اشخاص استفادہ کرسکتے ہیں،

مبسوط وہ تالیف ہے جو اپنے فن پر جامع ہو، اور اس میں تمام مشکلات ومباحثِ فن پر پوری تحقیق ہو، یہ علمی کمال اور مطالعہ کے لئے ضروری ہے،

مؤلفین کی تقسیم معتبر مولفین صرف دو قسم کے ہیں

الف وہ ائمۂ فن اور کاملین جنھیں کسی مخصوص فن سے پورا ذوق ہو، اور وہ اس میں راسخ ملکہ رکھتے ہوں اور ان کو اس کا وسیع تجربہ، اور اس کے مشکلات ومسائل پر گہری نظر ہو، ان کے دماغ میں اس فن کے بیشتر مسائل مستحضر اور مشکلات حل شدہ اور مرتب ہوا کرتے ہیں، ان کی تصنیف وتالیف فنی ملکہ پیدا کرنے اور تکمیل وفاضل بننے کے لئے ضروری ہے، چونکہ ان کے

الفاظ مرتب اور مہذب ہوتے ہیں، ان کی نظر دقیق اور تیز اور ان کی تحقیق جامع و مانع ہوتی ہے، اسلئے ان کی تالیفات سے کسی وقت استغنا ممکن نہیں، ان کے نتائج افکار اور لطائف و نکات بے شمار ہوتے ہیں، ہر ایک شخص ان کے کلام سے زیادہ سے زیادہ علمی فوائد و تحقیقات حاصل کرسکتا ہے،

ب وہ صاحب فضل وکمال مؤلفین جو ذہن سلیم اور طبع مستقیم رکھتے ہیں جنھیں انشاء و تحریر کا خاص سلیقہ ہے، اگرچہ وہ ائمۂ فن و کاملین کا سا رسوخ علمی اور تبحر نہیں رکھتے، مگر اس خاص فن سے محض کورے اور نابلد بھی نہیں ہوتے، ان کے مطالعہ میں ائمۂ فن کی اعلیٰ و بیش بہا کتابیں رہیں، انھوں نے اپنی تحریر و انشاء کے ذریعہ متقدمین کے مضامین ملخص و مرتب صورت میں پیش کئے، ایسی تالیفات سے مبتدی اور متوسط طبقہ مستفید ہوسکتا ہے، ان دونوں طبقہ کے متعلمین کو ان تالیفات پر توجہ کرنی چاہیئے،

(۶) کسی استاد کامل اور ماہر فن مشفق سے علم حاصل کرنا چاہیئے، فضلاء کا مقولہ ہے العلم فی الصدور لا فی السطور، (یعنی علم در سینہ نہ در سفینہ)

تربیت و تعلیم کا طریقہ | استاد کامل کا فرض ہو کہ جو فن طالب علم کو سکھائے، پہلے اسکو خاص طور پر مرتب کرے، ابتدا میں ضروری اور عام فہم مسائل کی سادہ طور پر تعلیم دے، پھر رفتہ رفتہ ترقی اور شرح و بسط دلائل و شواہد کا اضافہ کرتا جائے جب طالب علم کو ایک حد تک تیار کرلے تو پھر مشکلات فن اور اعتراضات و جوابات سے مانوس کرے، اس طرح تدریج اسے کامل تحقیق کے واسطے تیار کرے،

(۷) علمی مذاکرہ جاری رکھے احباب اور اہل علم سے علمی بحث و نظر تحقیق و تنقید کا سلسلہ قائم کرے، لیکن اس سے محض علمی تعاون استفادہ و افادہ مقصود ہو، مکابرہ و مجادلہ نہیں کہ المذاکرۃ تلقیح العقول "عقل کی ترقی وکمال مذاکرہ سے ہوتی ہے، کسی شاعر نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے

وَمَا بَقِيَتْ مِنَ اللَّذَاتِ إِلَّا — مُحَادَثَةُ الرِّجَالِ ذَوِي الْعُقُوْلِ

(آج تمام لذتوں میں سے صرف عقلمندوں سے مذاکرہ باقی رہ گیا ہے)

وَقَدْ كُنَّا نَعُدُّهُمْ قَلِيْلًا — فَقَدْ صَارُوْا أَقَلَّ مِنَ الْقَلِيْلِ

(ہم انھیں تھوڑا خیال کرتے تھے، مگر اب وہ اقل قلیل یعنی کالعدم ہوچکے)

دراصل مذاکرہ ہی سے آدمی اپنی صحیح قابلیت اور اپنی تحقیق کی اصلی حالت کا کچھ اندازہ کرسکتا ہے، تنہا کوئی شخص اپنے نقص و کمال تحقیق و تحریر کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتا، مذاکرہ سے بہت سے مشکلات حل ہوتے ہیں اور جدید تحقیقات کا انکشاف ہوتا ہے،

۸۔ جب کسی علم و فن میں کمال پیدا ہوجائے، تو اُسے ایک امانت الٰہی سمجھے اور اس فکر میں رہے، کہ جب موقع ملے، اُسے مستحق تک پہونچائے، خواہ تعلیم کے ذریعہ ہو یا تالیف و تصنیف کے ذریعہ اور اپنی علمی تحقیقات کو جہاں تک ممکن ہو تحریر میں مرتب و منظم کرتا جائے معلوم نہیں کب اسے ان کی ضرورت پیش آجائے، یا وہ اُسے دوسروں تک پہونچانے سے قبل ہی اس دار فانی سے رحلت کرجائے، یا اس کی صحت جواب دیدے، اور لوگ اسکے فوائد سے محروم رہ جائیں،

۹۔ کسی علم و فضل میں انتہائے کمال اور احاطہ و استقصاء کا ہرگز دعویٰ نہ کرنا چاہیئے ایسے لغو خیال کو نہ بھٹکنے دے، کیونکہ یہ حقیقی فضل وکمال سے اُسے محروم کردے گا، بلکہ ہمیشہ ترقی کا خواہاں رہے اور ہمیشہ رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (اے رب مجھے علم میں ترقی دے) کو اپنا نصب العین رکھے،

۱۰۔ ہر ایک علم و فن کی ایک غایت اور حد ہوتی ہے اس سے کبھی تجاوز نہ کرے، اکثر ایسا ہوتا ہے، کہ جو شخص کسی علم و فن میں ماہر و فاضل ہوتا ہے، وہ اپنے مخصوص علم و فن کی بابت مبالغہ اور غلو کیا کرتا ہے، اسے تمام علوم و فنون سے بڑھا دیتا ہے، اسکے لئے طرح طرح کے فضائل تلاش کیا کرتا ہے، اس کے واسطے حیثیں گڑھتا ہے، اسکی ہرگز ضرورت نہیں بلکہ اس سے بچنا چاہیئے،

۱۱- تقریر، تحریر اور مناظرہ میں ایک علم وفن یا اسکی اصطلاحات کو دوسرے علم وفن میں ہرگز نہ ملائے، اس طریقہ سے ایک تو اسکی علمی کمزوری اور فرومائگی ظاہر ہوگی، دوسرے لوگوں کو اس سے تشویش خاطر اور اشکال پیدا ہوگا،

۱۲- استاد کے آداب وحقوق کا خاص طور پر لحاظ کرے، اسکندر سے کسی نے دریافت کیا، آپ اپنے استاد کا اس قدر کیوں احترام کرتے ہو، جو باپ سے بھی زیادہ معلوم ہوتا ہے،؟ جواب دیا، "باپ مجھے دار الفنا میں لایا مگر معلم مجھے دار البقا کی رہبری کرتا ہے"

اسی طرح ہم سبق بھائیوں سے اخوت کا برتاؤ کرتا رہے، شاگرد کو اولاد کے قائم مقام سمجھے،

غرض اس طرح سب حقوق وفرائض کا پورا پورا لحاظ کرے،

تذکرۃ السامع کا چوتھا باب کتابوں کی حفاظت اور ان سے متعلق بعض آداب ونصائح پر مشتمل ہے، جو ص ۱۶۳ سے ص ۱۹۳ تک ہے،

باب پنجم، مدرسوں کے متعلق اور ان میں اقامت کے آداب پر ہے، یہ ص ۱۹۳ سے ص ۲۳۶ تک ہے،

یہ مباحث تعلیم المتعلم والمعید وغیرہ میں بھی ہیں،

آداب تالیف وتصنیف، اور نقل وتصحیح کتب کے قواعد وضوابط فن اصول حدیث کے آخر میں کافی بسط وشرح سے ملتے ہیں،

ائمہ فن نے تعلیمات پر جو کتابیں چھوڑی ہیں ابتک ان کا بڑا حصہ نایاب ہے، ابن حزم الاندلسی کی ایک کتاب "مراتب العلوم" کے نام سے معنون ہے، جس میں علوم وفنون سے متعلق اہم معلومات ہیں اور ہر ایک فن کی اعلیٰ تالیفات اور ان کے مدارج وغیرہ بیان کئے گئے ہیں، نیز متفرق علوم وفنون کی تعلیم کا طریقہ اور ان کی ترتیب بیان کی گئی ہے، ابوبکر بن العربی الاندلسی نے "العواصم من القواصم"

کے آخر میں علوم وفنون اور اپنے زمانہ کی تعلیمی حالت اور طریق تعلیم پر مفید بحث کی ہے،

موجودہ تعلیم اور مسلمان

ایک زمانہ میں ہر عالم کا گھر مدرسہ اور ذی حیثیت کا گھر مکتب یا دار العلم تھا، قوم کو تعلیم سے بیحد دلچسپی تھی، اس کے لئے زیادہ سے زیادہ قربانی کرتے تھے، بڑی بڑی جائدادیں وقف کیجاتی تھیں، اہل علم کی تلاش ہوتی تھی، اور بڑے بڑے مراتب واعزاز ان کے لئے مخصوص تھے، اب صرف تاریخ کے پارینہ اوراق میں ان کا کچھ کچھ پتہ مل سکتا ہے،

مسلمانوں نے جہاں اپنی بہت سی مذہبی خصوصیات آہستہ آہستہ چھوڑ دیں، علم کے میدان میں بھی آج وہ سب سے پیچھے نظر آتے ہیں، خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں میں دینی اور دنیاوی تعلیم کی کمی بالکل عیاں ہے،

(۱) چند اداروں کے سوا عموماً مذہبی تعلیم کے ادارے بہت معمولی درجہ کے اور کم تعداد میں ہیں اعلیٰ درجہ کے نہ ابتدائی مدارس ہیں، اور نہ اعلیٰ تعلیم کے دار العلوم ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کی خاک چھانئے کسی جگہ مسلمان بچوں کی صحیح مذہبی تربیت وتعلیم کا کوئی مرکز نظر نہ آئے گا،

(۲) پھر ان مدارس اور اداروں کی مالی حالت نہایت خراب بلکہ ناگفتہ بہ رہتی ہے، اسکے برعکس دوسری قوموں کے بیشمار مدارس ہیں، اور مالی اور علمی ہر اعتبار سے قابل اطمینان ہیں

(۳) صنعت وحرفت کے ادارے جن کی سب سے بڑی ضرورت تھی بہت کم ہیں،

(۴) اسی طرح غربا اور یتامیٰ کی تعلیم وتربیت کا کوئی معقول انتظام نہیں، اور جس قدر ہے وہ ناکافی اور غیر مفید ہے، ہماری قوم میں غربا کی اکثریت ہے، اس لئے اس کی طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے،

(۵) عربی تعلیم تقریباً فنا ہو رہی ہے، انگریزی تعلیم میں بھی باکمال شاذ ونادر ہی نکلتے ہیں خاص مسلمانوں کے علمی ادارے ہی نہیں ہیں جو مشترک ہیں، ان کی باگ قوم کے سچے بہی خواہوں کے ہاتھ

یں نہیں، بلکہ ان پر دوسری قوموں کا غلبہ ہے،

آج ہمیں ڈاکٹری اور دوسرے ضروری شعبوں میں ہندوستان کی زبردست اسلامی آبادی میں برائے نام مسلمان ملیں گے،

(۶) جس طرح عربی تعلیم سے سچے مبلغ، خطیب اور محدث و فقیہ کی ضرورت ہے، اسی طرح انگریزی تعلیم سے ڈاکٹر، انجنیر، اور ماہرین فنون جدیدہ درکار ہیں، جو مختلف قومی و ملی اداروں میں کام کر سکیں،

(۷) ضرورت تھی کہ تمام دنیاے اسلام خصوصاً ہندوستان کے مسلمان عربی اور انگریزی کا ایک مشترکہ نصاب بناتے، جو خود ان کی کتابوں پر مشتمل ہوتا، یہ نصاب تمام مدارس میں جاری ہوتا اور سب میں ایک سا نظام ہوتا، لیکن اسکی امید نہیں، دوسری قومیں اپنے لئے ہر قسم کا راستہ صاف کرتی جارہی ہیں، ہمارا کام محض شور و غوغا اور بے عملی کی زندگی گذارنا ہے، حد یہ ہو کہ آج تک اردو اور دینیات اردو کے اعلیٰ معیار کے رسائل تیار نہ ہو سکے، نہ اسلامی اور غیر اسلامی دنیا کی تاریخ کی درسی کتابیں اردو میں تیار کی گئیں، بازار میں آئے دن اس قسم کی کتابیں نکلتی رہتی ہیں، مگر ان میں سے ایک بھی معیاری نہیں کہی جا سکتی[1]،

ہمارے لئے "کتاب اللہ" کا متن متین ابدی اور سرمدی سرچشمۂ حیات ہے، یہ بدستور قائم و باقی رہے گا، باقی ہر علم و فن کی کتابیں ہمیشہ تنقیح و تحقیق، رد و بدل اور کمی و بیشی کی محتاج ہیں، عربی کی تعلیم کی بڑی اصلاح و تنظیم کی ضرورت ہے، اسی طرح انگریزی کے لئے بھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے،

ہمارا اولین فرض ہو کہ تعلیم خواہ کوئی سی ہو، اپنے مذہب اپنی تاریخ اور اپنی روایات کو ہاتھ سے نہ جانے دیں، ہماری پوری زندگی، مذہبیت کی روح میں ڈوبی ہوئی ہونی چاہئے، ورنہ موجودہ تعلیم خواہ

[1] معارف اسلامی تاریخ کا سلسلہ دار المصنفین میں مکمل ہو چکا ہے، اسکی پہلی جلد چھپ کر شائع ہو چکی ہے،

عربی کی ہو، خواہ انگریزی کی، اسلامی روح سے بہت دور، اور صحیح تبلیغی شان سے سراسر اجنبی بنا دیتی ہے،

یہ بحث بہت لمبی ہے، جس کا یہ مضمون متحمل نہیں، سر دست اتنے ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے،

نفس اور جسم

از

جناب خواجہ عبدالحمید صاحب ایم اے، لکچرار فلسفہ گورنمنٹ کالج لائل پور،

(۲)

۸۔ متذکرۂ بالا جوابی حملہ (۱۔ سے ۷ تک) جو تفاعلیت کے حامیوں کی طرف سے ہوا ہے، اس حقیقت کے ثبوت کے لئے کافی ہے، کہ متوازیت کی بنیادیں بہت کمزور ہیں، سچ تو یہ ہو کہ متوازیت کو صرف مشکلات سے گریز سمجھنا چاہئے، متوازیت صرف اس بات پر ٹھہر جاتی ہے کہ چونکہ تفاعل کا سمجھنا آسان نہیں ہے، اسلئے اس کا سرے سے انکار ہی کر دیا جائے اور بجائے اسکے کہ کوئی نیا نظریہ پیش کرکے ان مشکلات کا حل ڈھونڈا جائے، اور اس عقدہ کی کشایش کیجائے صرف اس بات پر ڈٹ جائیے کہ جسم کی عملداری الگ ہے، اور ذہن کی عملداری الگ، اور ان دونوں میں باہمی لین دین تعامل اور تفاعل ہے ہی نہیں، البتہ ہیں دونوں بھلے مانس، اگر ایک دوسرے سے بات چیت نہیں کرتے، تو کم از کم جھگڑتے بھی نہیں، دو متوازی سلسلوں میں وہ اپنا اپنا کام کئے جا رہے ہیں، یہ ممکن ہے کہ پس پردہ کوئی فاعل موجود ہو جو ان دو سلسلوں کو (گاڑی کے دو گھوڑوں کی طرح) متوازی راستوں پر چلا رہا ہو، لیکن ہم پس پردہ جائیں کیوں؟ ہمیں تو اسی پر ٹھہر جانا چاہئے کہ جسم و ذہن کے یہ دو سلسلے متوازی جا رہے ہیں،

یہ ہے متوازیت کا نقطۂ نظر،

ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال اور یہ طرزِ استدلال کسی متفکر کے لئے ہرگز تسلی بخش نہیں ہو سکتا، وہ ایک مصنوعی اور باطل سد کے سامنے دیر تک کھڑا رہ نہیں سکتا، اسے خود اپنی صحت کی بقا کے لئے یہ سد گرانا ضروری ہو جاتا ہے، اس لئے متفکر کے لئے متوازیت صرف ایک عارضی مقام بن سکتی ہے، منزل ہرگز نہیں، حقیقتِ حال بھی یہی ہے متوازیت کے مبلغ بالعموم وحدۃ الوجود یا وحدتِ جوہر کے نظریہ پر جا کر ٹھہرتے ہیں یعنی یا تو وہ یہ کہتے ہیں، کہ صرف ایک ذات موجود ہے، اور جو کچھ ہے وہ اسی ایک ذات کا پرتو ہے، اور یا یہ کہتے ہیں، کہ مادہ اور روح جسم و ذہن کی تفریق بالکل باطل ہے، دونوں ایک ہی چیز ہیں، یہاں وحدۃ الوجود یا وحدتِ جوہر کی بحث میں الجھنا مقصود نہیں ہے، کیونکہ اس مقالہ کا مقصد صرف یہ ہے، کہ نفس و جسم یا ذہن و مغز کے تعلق کی حقیقت و نوعیت کی بحث میں جو کچھ کہا جائے، وہ حتی المقدور مابعد الطبیعیاتی قیاسات[1] و دلائل کو چھوڑ کر کہا جائے،

یہاں یہ پوچھا جا سکتا ہے، کہ جو سائنسدان متوازیت کے حامی ہیں، وہ اس نظریہ پر مطمئن کیوں ہیں،؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ بالعموم صرف اسلئے مطمئن ہیں، کہ انھوں نے اس پر غور نہیں کیا، اور نہ غالباً اس پر غور کرنے کے لئے ان کے پاس (سائنسداں ہونے کی حیثیت سے) وقت ہے، اس مسئلہ کی حیثیت ان کے لئے محض ضمنی ہو، سائنسدان ہونے کی حیثیت سے ان کا کام حوادث و مظاہرِ قدرت کا بیان، تشریح اور علت جوئی ہے، ان مقامات سے گذرنے کے بعد ان کے سامنے اصل اور غایت کے مابعد الطبیعیاتی سوال آتے ہیں، جن سے ان کو کوئی خاص سروکار نہیں، جو سائنسدان

---

[1] مابعد الطبیعیات یا فلسفہ الٰہیات سے مراد وہ علم تحقیق ہے، جو تمام دوسرے علوم کے بنیادی تصورات اور اولیات اور ان کے آخری ناقابلِ حل مسائل سے بحث کرتا ہو، باقی علوم کا تعلق مظاہر قدرت اور حوادث سے ہوتا ہے لیکن مابعد الطبیعیات اصل اور غایت سے بحث کرتا ہو،

ان سوالات پر بحث کرتا ہے، (اور متوازیت، تفاعلیت یا کسی اور نظریہ کے حق میں تفکر کرتا ہے) وہ اپنی سائنسدانی کی حیثیت کو عارضی طور پر چھوڑ کر فکری حیثیت اختیار کر لیتا ہے، علوم حیاتیات و نفسیات کے محققین کے لئے البتہ ایک خاص مقام پر پہونچکر یہ بحث ناگزیر ہو جاتی ہے، کہ آخر جسم و ذہن یا مادہ و حیات کا باہمی تعلق کیا ہے، ؟ ایسے ہی مفکر اس مسئلہ کی تحقیق اور تشریح میں زیادہ حصہ لے رہے ہیں،

۹- تفاعلیت جس طرح سے اپنے خلاف اعتراضات کو رد کرتی ہے، اُسے آپ اوپر پڑھ چکے اب وہ ایک قدم آگے بڑھتی ہے، اور اپنی تائید میں اور متوازیت کے خلاف دلائل پیش کرتی ہے،

استقرائی علوم کے اولیات دو ہیں، قانون علیت، قانون یکسانی فطرت، قانون علیت کہتا ہے، کہ ہر اُس چیز کے لئے جو حادث ہے، کوئی علت ضرور موجود ہے، یعنی کوئی حادثہ اسوقت تک واقع ہو نہیں سکتا، جب تک اس کیلئے علت موجود نہ ہو، اس قانون کی ایک نہایت ضروری اور جدید شق یہ بھی ہے کہ علت (جو معلول سے کچھ عرصہ پہلے واقع ہوتی ہے) اپنے معلول میں تدریج بدل جاتی ہے، مثلاً اگر ج علت ہے د کی، تو مراد یہ ہے، کہ جو قوت ج میں تھی، وہ کچھ عرصہ کے بعد د کی شکل پا گئی ہے، اس نقطہ نظر سے کہنا پڑتا ہے، کہ علت و معلول اپنی نوعیت میں ایک دوسرے سے بالکل الگ نہیں ہوتے، اُن کے اندر ایک قسم کی ہم آہنگی پائی جاتی ہے، اور وہ ایک ہی سلسلہ کی دو اہم کڑیاں ہیں،

قانون یکسانی فطرت کہتا ہے کہ قدرت کے معمولات ہی اسکی سنت ہیں، اور کچھ عرصہ کے مشاہدہ کے بعد ہم ان میں سے بہت سے معمولات کو پا جاتے ہیں، جو کچھ ہو رہا ہے وہ ان معمولات کے مطابق ہو رہا ہے، اسلئے اگر آج کسی خاص ماحول کے اندر کوئی خاص حادثہ واقع ہوا ہے تو ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں، کہ آئندہ بھی جب وہی ماحول ہوگا، تو اُسی قسم کا حادثہ وقوع پذیر

ہوگا، مثلاً آج اگر پانی کے پینے سے ہماری پیاس بجھ گئی ہے، تو آئندہ بھی یہی ہوگا، ان دونوں قوانین کو اکٹھا کر دینے سے ہمیں ایک جامع قانون یکسانی سلسلۂ علیت ہاتھ آئے گا، اس قانون کے مطابق ہم کہہ سکتے ہیں، کہ علت و معلول کا سلسلہ ہمیشہ یکسان قائم رہتا ہے، مثلاً اگر کسی خاص ماحول میں کسی خاص علت نے کوئی خاص معلول پیدا کیا ہے، تو آئندہ بھی ہمیں اُس قسم کی علت سے اُسی قسم کے ماحول میں اُسی قسم کے معلول کے ظاہر ہونے کی توقع رکھنی چاہئے،

(۱) اب تفاعلیت کا پہلا اعتراض یہ ہے، کہ متوازیت سے قانون علیت (یعنی قانون یکسانی سلسلہ علل) کی شکست اور اس کا نقض لازم آتا ہے، حالانکہ یہ بنیادی قانون تحفظ قوت کی تعمیم سے بدرجہا زیادہ اہم، یقینی اور محقق ہے، خود تفاعلیت نہ صرف اس نقض سے بری ہے، بلکہ اس کا انحصار تمام تر اس قانون پر ہے، اور اس دعوی کا ثبوت یہ ہے،

اگرچہ مظاہر قدرت مختلف ماحول کے اندر پیدا ہونے اور مختلف شرائط سے بندھے ہونے کے باوجود ہمیشہ ایک ساتھ (یعنی تقریباً ایک ہی زمانہ میں) حادث ہوتے رہیں، تو اس سے ہم نتیجہ نکال سکتے ہیں، کہ یہ مختلف مظاہر قدرت آپس میں کسی علّی رشتہ سے جکڑے ہوئے ہیں، یہ ہو سکتا ہے کہ ہم اس علّی رشتہ کو اس وقت یا اُس کے بعد بھی نہ پا سکیں، مثلاً فرض کیجئے، کہ چند دیہاتوں میں موسمی بخار کی وبا پھوٹ پڑی ہے، بہت سے لوگ بیمار ہو گئے ہیں ہم اس وبا کا سبب دریافت کرنا چاہتے ہیں، ہم دیکھتے ہیں، کہ مریض مختلف حیثیتوں کے، مختلف عادات و اطوار کے مختلف عمروں کے اشخاص ہیں، جن کا کھانا بھی مختلف تھا، ان کی روزمرہ کی صحت کا معمول بھی مختلف تھا، اور ان کے دیہات بھی مختلف تھے، لیکن ایک بات میں سب یکساں نکلے، ان وبازدہ دیہاتوں میں غلیظ پانی کے جوہڑ موجود ہیں، اور وہاں مچھروں کی بہتات ہے، یہ بھی ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں ایسے جوہڑ زیادہ ہیں، وہاں وبا کی شدت بھی زیادہ ہے، اور جہاں نسبتہً صفائی اچھی ہے، اور مچھر کم ہیں،

دہاں وبا کی شدت بھی کم ہے، اس سے ہم نتیجہ نکالیں گے، کہ غلیظ پانی کے جوہڑ اور مچھروں اور موسمی بخار کی وبا میں علت و معلول کا رشتہ ہے، یہ استدلال صحیح ہے، اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جب کبھی ہمیں حسیات حاصل ہوتی ہیں، (یعنی اپنے حواس کے ذریعہ سے ہمیں گرمی، سردی، ذائقہ وغیرہ محسوس ہوتا ہے) تو ان ذہنی یا نفسی حالتوں کے ساتھ ساتھ، ہمارے مغز اور عصبی نظام کے اندر عصبی تغیرات بھی ہوتے رہتے ہیں، اور کبھی ایسا نہیں ہوتا، کہ یہ حسیات موجود ہوں، اور عصبی تغیرات ان کے ساتھ واقع نہ ہوئے ہوں، اس سے ہم یہ نتیجہ نکالنے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ عصبی تغیرات اور حسیات میں کوئی علی تعلق یا رشتہ موجود ہے، (یعنی ہر ذہنیہ کسی عصبیہ کے ساتھ ساتھ واقع ہوتا ہے) یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ تعلقِ علیت کس نوع کا ہے، ہم صرف یہ اعتراف کرتے ہیں، کہ تعلقِ علیت ہے ضرور موجود اب اس استدلال سے جسم و نفس یعنی مغز و ذہن میں تفاعلیت کا تعلق ثابت ہوتا ہے، اس کے برعکس متوازیت اس تعلقِ علیت سے چشم پوشی کرتی ہے اور ایک بین حقیقت کو بے وجہ نظر انداز کر دیتی ہے،

۱۰۔ متوازیت کے بعض متوالے یعنی متعصب ترین طبقہ کے مادیین؎ یہ کہہ دیتے ہیں، کہ ہاں ہم اس تعلق کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن ہم یہ کہتے ہیں، کہ یہاں جسم و نفس، یعنی مغز و ذہن، دو مستقل اور مختار ہستیاں موجود نہیں ہیں، بلکہ معاملہ کی حقیقت یہ ہے کہ ہستی صرف ایک ہے، یعنی جسم و مادہ (اور مغز مادہ کی ایک صورت ہے) اور جس شے کو آپ روح یا نفس یا ذہن یا فکر کہتے ہیں، وہ دراصل اسی ایک واقعی ہستی کا پرتو ہے، اور اس کی حیثیت بالکل ایک غیر حقیقی سایہ یا

؎ انیسوی صدی عیسوی کے اخیر میں اس قسم کی مادیت کو جرمنی میں ہیگل (Haeckel) نے اور انگلستان میں ہکسلے نے نہایت پرزور طریقہ سے پیش کیا ہے، مثلاً ہکسلے کہتا ہے کہ جس طرح گردوں سے بول خارج ہوتا ہے، یا آنکھ کے غدود سے آنسو جاری ہوتے ہیں، یا جگر سے صفرا پیدا ہوتا ہے، اُسی طرح مغز سے خیالات پیدا ہوتے ہیں"

پرچھائیں کی سی ہے، مادیین کا یہ گروہ تعداد میں بہت کم ہے، لیکن ان میں ایک خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے مقدمات کو ان کے منطقی نتیجہ تک پہنچانے سے گریز نہیں کرتے، خواہ وہ نتیجہ دوسروں کو کتنا ہی لغو اور بے حقیقت نظر آئے، پچھلی صدی کے اخیر میں اس گروہ کی قیادت جرمنی میں ہیگل نے کی اور انگلستان میں اس نظریہ کو ہکسلے نے پیش کیا لیکن آج کل جب خود مادہ ہی طبیعیات جدید کی ہمت سے تصورِ قوت میں غائب ہو رہا ہے، کوئی منفکر اس شدت کی مادیت کی تبلیغ کی جسارت نہیں کرتا، مادیت کے اس سخت نظریہ کے مطابق ذہن و نفس کی حقیقت مستقل طور پر کچھ بھی نہیں، ذہن و نفس کی حقیقت بس ایسی ہے، جیسی انسان کے سایہ کی، سایہ کی موجودگی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، لیکن کسی شے اور اسکے سایہ میں جو زمین و آسمان کا فرق ہے، وہ ظاہر ہے، جس طرح سایہ کا اثر اس شے پر کچھ بھی نہیں ہوتا، اُسی طرح (ان منفکرین کے نزدیک) ذہن و نفس کا اثر بھی مغز و جسم پر کچھ بھی نہیں، جس طرح ایک لمحہ کے بعد سایہ کی جو کیفیت یا حرکت ہو رہی ہے، وہ خود سایہ کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ اس شے کی وجہ سے ہے، جس کا وہ سایہ ہے، اسی طرح نفس و ذہن و شعور کی حالتیں ایک دوسرے کے لئے کوئی علی حکم نہیں رکھتیں، بلکہ اپنے سلسلۂ علل کے لئے جسم و مغز کی حرکت و حالت کے تابع ہوتی ہیں، مادیت کی اس صورت کو ہم نظریہ ضمنیتِ ذہن؎ کہہ سکتے ہیں، اس کے خط و خال شکل نمبر ۲ سے ظاہر ہوتے ہیں، اب ج د وغیرہ مغزی حالتیں ہیں، جو حقیقی ہیں، اور مستقل و مختارانہ حیثیت رکھتی ہیں، ان کا ایک دوسرے کے

شکل نمبر ۲

انسان

ذہنیہ	عصبیہ
ل	ا
م	ب
ن	ج
و	د
وغیرہ	

؎ Epiphenomenalism.

ساتھ علت و معلول کا رشتہ قائم ہے، ا سے ب پیدا ہوتا ہے، ب ج کی علت ہے، اور اسی طرح آگے،
لیکن ذہنی حالتوں میں یہ رشتہ علل موجود نہیں ہے، ل معلول ہے ا کا، ھ معلول ہے ب کا وعلیٰ ہذا
لیکن ل ھ ن و (یعنی ذہنی حالتوں) میں کوئی باہمی تعلق نہیں ہے، وہ سایہ کی طرح پیدا ہوتی
ہیں، اور سایہ کی طرح ہی گم ہو جاتی ہیں، ان کی حیثیت مستقل و مختارانہ نہیں ہے، بلکہ محض اضافی اور تابع ہے،

نفسیاتِ جدید میں مادیت کی اس شکل کو آج کل نظریہ کرداریت[۱] کہتے ہیں، اس نظریہ کو اگر صحیح مان
لیا جائے، تو علمِ نفسیات کا نام بھی غلط ہو جائے گا، کیونکہ نفس تو کوئی واقعی ہستی ہے نہیں، جو علمِ نفسیات
کے نام سے مشہور ہے، اور نفس کی خیالی صورتوں کے مطالعہ میں اپنا وقت ضائع کر رہا ہے، اُسے صرف
انسان اور حیوان کے کردار کی نہایت باریک، دقیق اور جامع تحقیق کرنی چاہئے، انسان اور حیوان
سے جو عمل سرزد ہوتا ہے، وہ کسی محرک یا مہیج کی جوابی صورت کی حیثیت سے ہوتا ہے، یعنی اگر محرک و مہیج
نہ ہو تو عمل بھی صادر نہ ہوگا، جب آپ کسی انسان یا کسی حیوان کا پورا اور دقیق مطالعہ کریں گے تو آپ اس
قابل ہو جائیں گے، کہ اس کے عمل کے متعلق کوئی صحیح پیشین گوئی کر سکیں، انسان و حیوان صرف زندہ مشینیں
ہیں، آپ کسی مشین کی ساخت اور ماموریت کو اچھی طرح سے سمجھ لیجئے، پھر آپ مشین کے آیندہ عمل کے
متعلق صحیح حکم لگا سکیں گے، اسی طرح آپ انسانی اور حیوانی مشینوں کو اچھی طرح سے سمجھ لیجئے، اور ان کے
متعلق بھی صحیح صحیح پیشین گوئی کر لیجئے، باقی رہی وہ چیز جسے مفہوم یا معنی یا تفکر کہتے ہیں، سو وہ تو محض پرانی
نفسیات کا ایک ڈھکوسلا ہے، جو کچھ ہے صرف مشین ہے، مشین کے پرزے ہیں اور پرزوں کی ماموریت
ہے، شعوری ذہنی نفسی حالتیں محض پرچھائیں ہیں، جن کی حقیقت کچھ بھی نہیں،

یہ ہے مختصر سا خاکہ نظریہ ضمنیت ذہن اور اس کی جدید بیٹی یعنی نظریہ کرداریت کا، یہاں ان پر مفصل
جرح کی ضرورت نہیں ہے، البتہ چند اعتراضات کو ضرور ذہن نشین کر لینا چاہیئے،

[۱] Behaviourism

(۱) اوپر قانونِ علل (ہر حادثہ کی کوئی علت ہوتی ہے) کا مختصر ذکر ہو چکا ہے، اس قانون کی
ایک شق یہ ہے کہ علت کی قوت معلول میں منتقل ہو جاتی ہے، یعنی علت و معلول ایک دوسرے سے
مختلف ضرور ہوتے ہیں، لیکن دونوں نہایت مضبوط رشتے میں بندھے ہوتے ہیں، بلکہ یوں کہئے کہ
دونوں ایک ہی قوت کی دو مختلف شکلیں یا ایک ہی سلسلہ کی دو کڑیاں ہیں، اگر قانونِ علل کی ضمنی شق
صحیح ہے (اور جدید سائنس اسے ایک اہم اصول تسلیم کرتی ہے) تو پھر اگر علت اپنے اندر واقعیت اور
مستقل حیثیت رکھتی ہے، تو اس علت کا معلول بھی اُسی درجہ کی واقعیت اور مستقل حیثیت رکھے گا، اس
سے لازم آیا، کہ اگر ایک مغزی حالت (مغزیہ یا عصبیہ) حقیقی ہے، اور مستقل حیثیت رکھتی ہے (جیسا کہ
مادیت اور کرداریت کا دعویٰ ہے) تو ذہنی حالت (یعنی ذہنیہ) جو اسی مغزیہ کا معلول کہی جائے گی
وہ بھی اسی طرح حقیقی ہوگی، اور مستقل حیثیت رکھے گی، نتیجہ یہ نکلا کہ مادیت اور کرداریت خود سائنس
ہی کے اصولوں سے غلط ثابت ہوئیں،

۲ منطقی لحاظ سے بھی مادیت کے یہ دونوں نظریے بالکل غلط ہیں، مشاہدہ بتاتا ہے کہ کسی ایک
لمحہ میں میری جو حالت ہوتی ہے، وہ مرکب ہوتی ہے، اس کا ایک حصہ مغزیہ ہوتا ہے، اور دوسرا ذہنیہ
اور یہ دونوں اکٹھے حادث ہوتے ہیں، اس کے بعد ایک اور مرکب حالت ظاہر ہوتی ہے، اور اس
میں بھی مغزیہ اور ذہنیہ دونوں عنصر موجود ہوتے ہیں، یعنی ایک
لمحہ پہلے مرکب حالت یہ تھی، (دیکھو شکل نمبر ۲) ا۔ل یعنی مغزیہ اور ذہنیہ
اس کے بعد ب ھ (مغزیہ اور ذہنیہ) پھر ج ن (مغزیہ و ذہنیہ)
غرض ہر لمحہ میں میری حالت مرکب ہوتی ہے، جو پہلے گذرتی ہے اُسے
علت کہہ سکتے ہیں، جو بعد میں آتی ہے، وہ معلول بنتی ہے، اور جو اس
کے بعد آتی ہے، وہ اس دوسری حالت کی معلول کہلائے گی،

شکل نمبر ۲
انسان
ال
↓
ب ھ
↓
ج ن
↓
وغیرہ

خ لا ب ھ معلول ہے ل کا، اور علت ہے ح ن کی، ان مرکب حالتوں کا یہ تواتر شکل نمبر ۴ سے ظاہر ہوتا ہے،

اب مادیت (نظریہ ضمنیت و کرداریت) یہ بے انصافی کرتی ہے کہ ہر مرکب حالت کو خیالی طور پر ذہنیہ اور مغزیہ ٹکڑوں میں تحلیل کر دیتی ہے، اور پھر بلا وجہ حکم لگا دیتی ہے، کہ ہر مغزیہ علت ہے اگلے مغزیہ حصہ کی، لیکن ذہنیہ حصے اپنے اپنے درجوں کے مغزیہ حصوں کے معلول ہیں، اور خود کسی ذہنیہ یا مغزیہ حصہ کی علت نہیں بن سکتے، مادیت کے اس غلط استدلال کے جواز کے لئے کوئی بودی سے بودی دلیل بھی موجود نہیں ہے، متوازیت البتہ ایک قدم پہلے ہی سہم کر ٹھہر جاتی ہے، اور کہہ دیتی ہے کہ مغزیہ حصوں میں الگ سلسلۂ علل قائم ہے، اور ذہنیہ حصوں میں الگ، دونوں سلسلے متوازی طریقے سے بڑھتے ہیں، لیکن ان میں باہمی لین دین بالکل نہیں ہے،

مادیت اور متوازیت دونوں سے منطقی ربط کی شکست اسلئے لازم آتی ہے، کہ وہ بلا وجہ دو مرکب حالتوں کو ان کے عنصروں میں تقسیم کرکے حکم لگا دیتے ہیں، کہ پہلی مرکب حالت کا فلان حصہ دوسری مرکب حالت کے فلان حصہ کی علت ہے، علمی دیانت انھیں صرف یہ کہنے کی اجازت دیتی ہے، کہ فلاں مرکب حالت، فلاں مرکب حالت کی علت ہے، اور ان دونوں مرکب حالتون میں مغزی اور ذہنی عناصر موجود ہیں، نظریۂ تفاعلیت اپنا استدلال اسی نقطۂ نظر پر قائم کرتا ہے،

۳۔ متوازیت کا استدلال تو خالص اور راشد مادیت سے بھی زیادہ بودا ہے، مادیت میں کم از کم یہ خوبی تو ہے، کہ اس کے غلط اصولوں سے غلط اور لغو نتائج بھی نکل سکتے ہیں، وہ ان کے اخذ کرنے سے جھجکتی نہیں، اس کے برعکس متوازیت سہم کر ٹھہر جاتی ہے، اور ایسی جگہ ٹھہرتی ہے، جہاں اسکی کمزوری اور واضح ہو جاتی ہے، مثلاً جدید سائنس کے اصولوں کے مطابق مادی دنیا میں جو سلسلۂ علل قائم ہے، وہ سراسر میکانکی (مشینی) سمجھا جاتا ہے، یعنی یہ کہا جاتا ہے کہ حوادث یکے بعد دیگرے

ظاہر ہوتے ہیں، اور ان میں ارادہ، مقصد اور غایت کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا، یہ دعوی ہے میکانکی سائنس دانوں کا، عالمِ کائنات کو وہ ایک مشین مانتے ہیں، اور جس طرح مشین ارادہ، مقصد اور غایت سے محروم ہوتی ہے، اسی طرح یہ عالم بھی ان ذہنی و معنوی عناصر سے یکسر خالی ہے، مغز و جسم مادی ہیں، اس لئے سائنس کے اصولوں کے مطابق ان کی حالتوں میں جو سلسلۂ علل قائم ہے، وہ بھی میکانکی (مشینی) ہونا چاہئے، لیکن متوازیت خود تسلیم کرتی ہے کہ ان مغزی حالتوں کے سلسلہ کے بالکل متوازی ایک اور سلسلہ جاری ہے جس میں ارادہ، مقصد اور غایت روح رواں کا کام دیتے ہیں، یہ دونوں سلسلے ایک میکانکی اور دوسرا غایاتی ساتھ ساتھ اور متوازی جا رہے ہیں، گویا انسان مرکب ہے دو گھوڑوں سے جن میں ایک میکانکی ہے، اور دوسرا غایاتی، اور دونوں بھلے مانسوں کی طرح ایک رفتار سے اس انسانی گاڑی کو کھینچے لئے جا رہے ہیں، یہ استدلال کون صحیح مانے!

(۴) نظریۂ کرداریت کی حالت نہایت پر لطف ہے، اس کے مطابق، شعور، تفکر، مفہوم اور معنی ایسے اسم ہیں، جن کا مسمّیٰ نہیں، جو کچھ ہے وہ صرف کردار ہے، جو میکانکی (مشینی) اصولون کے مطابق جاری ہے، ارادہ، مقصد، غایت، اور مفہوم، بے حقیقت اوہام ہیں جن کا اس انسانی کرداری دنیا میں گذر نہیں، اس دعوی میں خرابی یہ ہے، کہ اگر یہ تصورات بالکل بے معنی ہیں اور معنی بالکل ایک غیر واقعی چیز ہے، تو کیا کرداریت کے مبلغ کے استدلال کو سمجھنے کی کوشش کرنا تضیع اوقات نہین ہے؟ جہاں بولنے والا خود ہی کہہ دے، کہ میری دنیا میں معنی عنقا چیز ہے تو پھر اس کے الفاظ میں کوئی شخص معنی تلاش کرے، اور اس جنسِ نایاب کو نہ پائے، تو مقرر بیچارے کا اس میں کیا قصور،؟

بات یہ ہے کہ سائنس داں جب تک امورِ واقعہ کے بیان و تشریح اور ان کے قوانین کی تحقیق جستجو میں مصروف ہوتا ہے، اس کا ایک ایک لفظ نہایت غور و خوض سے پڑھنے کے لائق ہوتا ہے،

لیکن جب وہ اپنا خالص ذہنی اور علمی میدان چھوڑ کر مفکر کی حیثیت سے نظریہ گڑھنا شروع کرتا ہے، تو ان نظریوں کو صرف اسلئے مان نہ لینا چاہئے کہ فلاں سائنس دان نے انھیں اختراع کیا ہے، بلکہ پورے شد و مد سے اُن پر جرح کرنی چاہئے، سائنسدان بھی انسان ہے، جب انسان کسی دلپسند نظریہ کو صحیح ثابت کرنے کی ٹھان لیتا ہے، تو استدلال کے جوشِ جنوں میں وہ ایسی باتیں کہہ گذرتا ہے جن کی تائید کے لئے اس کے پاس کوئی سامان نہیں ہوتا، کردارِیت اسی قماش کی ایک چیز ہے،

اب ہمیں مادیت کی اس ضمنی بحث کو چھوڑ کر اصل موضوع کی طرف لوٹنا چاہئے، کہ جسم و ذہن کا تعلق واقعی ہے، یا نہیں، اور اگر ہے، تو اسکی واقعیت اور نوعیت کے متعلق کیا کچھ کہا جا سکتا ہے، تفاعلیت اور متوازیت کا مناظرہ اسی مضمون سے متعلق تھا،

(۱۱) ایک شخص کوئی بات کہتا ہے مخاطب اس بات کو سمجھ لیتا ہے یہ سمجھنا کیا ہوتا ہے، اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ جو خیالات بولنے والے کے دل میں تھے، وہی یا اُس جیسے خیالات سننے والے کے دل میں پیدا ہو گئے ہیں، یعنی ایک کا مافی الضمیر دوسرے کا مافی الضمیر بن جاتا ہے، زبان اسی مقصد کے لئے بنی ہے، کہ جو کچھ میرے دل میں ہے وہی آپ کے دل میں اتار سکوں، ہر لفظ کا کچھ مطلب یعنی یا مفہوم ہوتا ہے، بولنے والا ایسے الفاظ چنتا ہے، جو اس کے دلی خیالات کو سمیٹ لیں، اور ان کی لفظی تصویر بنا دیں، جب مخاطب ان الفاظ کو سنتا ہے، تو وہ کہنے والے کے مفہوم کو سمجھ لیتا ہے، اگر انسان کی زندگی اور اس کے تمدن و تہذیب کی لمبی داستان کے بیان کے لئے ایک کلیدی لفظ ڈھونڈا جائے تو معنی سے بہتر لفظ شاید ہی مل سکے، مختلف زبانیں، کتبے، عمارتیں، آمد و رفت کے ذریعے اختراعات و ایجادات کیا ہیں، سب کسی نہ کسی شکل میں کسی نہ کسی شخص کے دل کے مفہوم و معنی کے اظہار و تشہیر کے ذریعے ہیں، جس نے معنی کے تصور کو نہ سمجھا، وہ انسانیت کو نہ سمجھا،

اب سوال یہ ہے کہ جب میرے ذہن میں کسی لفظ یا تصور یا فقرے کا مفہوم یا اس کے معنی موجود

ہوتے ہیں، تو میرے مغز میں اُس ذہنی حالت کے متوازی کونسا مغزیہ کام کرتا ہے، اور کس طرح کام کرتا ہے؟ مثلاً میں کچھ دیکھتا ہوں تو ماہر عضویات فوراً کہہ دیتا ہے، کہ مغز کے پچھلے حصہ کے فلاں فلاں ٹکڑے میں فلاں قسم کی حرکات ہو رہی ہیں، جب میں سنتا ہوں یا بولتا ہوں، یا کوئی ذائقہ محسوس کرتا ہوں تو وہی عضوی ماہر مجھے ٹھیک ٹھیک بتا دیتا ہے، کہ فلاں فلاں مغزی حصوں میں یہ یہ تغیرات اور حرکات ہو رہی ہیں، لیکن جب میں بات کرتا ہوں، اور عضوی ماہر کہتا ہے کہ فلاں مغزی حصہ جو الفاظ کے لئے مخصوص ہے، مصروفِ کار ہے، تو وہ مجھے یہ نہیں بتاتا، کہ الفاظ کا مفہوم جو میرے ذہن میں ہے وہ مغز کے کس حصہ کی اور کیسی حرکات کے ذریعہ سے ظاہر ہو رہا ہے، محسوسات (دیکھنا سننا سونگھنا وغیرہ) بھی نفسی حالتیں (یعنی ذہنیہ) ہیں، ان کی متوازی مغزی حالتوں (مغزیہ) کو ماہر عضویات فوراً بتا دیتا ہے لیکن جب ہم محسوسات سے اوپر کی ذہنی دنیا کی طرف جاتے ہیں، اور ان پیچیدہ اور اہم ترین ذہنی حالتوں کی متوازی مغزی حالتوں کے متعلق دریافت کرتے ہیں، تو عضوی ماہر خاموش ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ متوازیت کا حامی بھی جو ہر ذہنیہ کے لئے کسی مغزیہ کی موجودگی لازم سمجھتا ہے، چپ ہے،

مغز میں ان گنت مادی لیکن ذی حیات ذرات موجود ہیں، اب کیا ہر مغزی ذرہ کے متوازی کوئی خاص ذہنی ذراتی حالت بھی ہوتی ہے، ؟ اگر ہوتی ہے تو کیسے، ؟ پھر یہ مختلف ذہنی ذراتی حالتیں کیونکر مل کر مرکب ذہنی حالت کی شکل پاتی ہیں، ؟ ان سوالوں کا جواب بھی متوازیت کے پاس نہیں ہے،

یہ دو اعتراضات کہ معنی کی مغزی صورت کیا ہے؟ اور ہر مغزی ذرے کی متوازیت ذہنی حالت ہوتی ہے، یا نہیں، اگر ہوتی ہے تو کیسے، اور اگر نہیں ہوتی، تو متوازیت کہاں گئی، ؟ ایسے شدید ہیں کہ ان سے نہ صرف متوازیت کا بھانڈا پھوٹ جاتا ہے، بلکہ مادیت کی لاف زنی، اور مغز کے

بہت بڑے حصہ کے متعلق موجودہ سائنس کی لاعلمی بھی ظاہر ہوجاتی ہے، اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ تفاعلیت کے پاس ان مشکلات کا حل موجود ہے، ہرگز نہیں، فرق صرف یہ ہو کہ تفاعلیت ان امور کے متعلق اپنی لاعلمی کا اقرار کرتی ہے، لیکن چونکہ وہ ذہن ومغز میں تفاعل و تعامل کی قائل ہی، اسلئے مغز کے طریق کار کے متعلق جو انکشافات بھی ظہور پذیر ہوں گے، وہ اس نظریہ کو تقویت ہی دیں گے، اس کی تنقیص نہ کریں گے، اس کے برعکس (جیسا کہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں) متوازیت کے ضمنی اور منطقی نتائج اس قدر ناقابل حل وفہم ہیں، کہ ان سے خود متوازیت کا رد لازم آتا ہے،

(۳) تفاعلیت کا یہ امتیاز ایک اور طرح سے بھی ظاہر ہوتا ہے، مغز وذہن کے تعلق کی بحث میں نفسی مختلف مذاہب میں بٹے ہوئے ہیں، لیکن جب وہ اس بحث کو چھوڑ کر حسیات اور ان کے محرکات جذبات اور ان کے مہیج افعال، اور ان کے محرکات، اور ذہنیہ اور عصبیہ (مغزیہ) کا باہمی تعلق بیان کرتے ہیں، تو جو الفاظ، اور جو زبان بلاتکلف ان کی تصانیف میں استعمال ہوتی ہے، وہ تفاعلیت کی زبان ہے، مثلاً ہاتھ میں سوئی چبھی، اور درد محسوس ہوا کیوں؟ سوئی ہاتھ میں چبھی، اعصابی تار کا سرا (جو ہاتھ کی جلد میں ہے) متاثر ہوا، ایک اعصابی رو (جو بجلی کی طرح کی ہوتی ہے) حرام مغز میں سے ہوتی ہوئی مغز کے ایک خاص حصہ میں داخل ہوئی، وہاں اس رو کے پہونچنے پر چند خلیے[1] بموں کی طرح پھٹے، اور ہمیں درد (یعنی سوئی کے چبھنے کا نتیجہ) محسوس ہوا، اور یہ سب عمل آن کی آن میں ہوگیا، اب ترتیب دیکھئے ان عملوں کی، پہلے محرک (سوئی کا چبھنا) پھر اعصابی (مغزی) عمل اور پھر ذہنی حالت یہ تفاعلیت کی زبان ہے، متوازیت کی زبان نہیں، دوسری مثال لیجئے، میں چاہتا ہوں کہ اپنے ہاتھ سے قلم گرادوں، اس کے بعد گرا دیتا ہوں، یعنی پہلے ایک ذہنیہ حالت تھی اس کے بعد ایک جسمیہ (مغزیہ) حالت ظاہر ہوئی، یہاں بھی الفاظ ذہن ومغز میں تفاعل

[1] Cells.

ظاہر کرتے ہیں، ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے، کہ تفاعلی نقطہ نظر ایسے بیانات میں لابدی ہی، متوازیت کی زبان میں روزمرہ کے حالات کا بیان قریباً ناممکن ہی،

۱۲- متوازیت کا زور تمامتر اس بات پر صرف ہوتا ہی کہ حیوان اور انسان میں ذہنیہ اور مغزیہ سلسلے ایک دوسرے سے بالکل الگ ہوجاتے ہیں، اوپر ذکر ہوچکا کہ سائنسداں جسمی یا عصبی (مغزی) سلسلہ کو میکانکی (مشینی) سمجھتے ہیں، لیکن ذہنی سلسلہ میکانکی نہیں ہے، کیونکہ اس میں قدم قدم پر مقصد، ارادہ اور غایت کام کر رہے ہیں، اب یہ دو مختلف سلسلے یعنی ایک میکانکی، اور دوسرا غایاتی، ہرگز ہم آہنگ نہیں ہوسکتے، اور نہ ان میں ہر لمحہ متوازیت ہی قائم رہ سکتی ہے، ایک کہہ رہا ہو کہ وہ حوادث زمانہ اور مظاہر قدرت محض طبعی حرکت کا نتیجہ ہیں، دوسرا کہتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کسی غایت یا مقصد سے ہو رہا ہے، اور کسی نہ کسی کا ارادہ اس طبعی حرکت کا محرک ہے، ایسے دو سلسلوں کا (اگر دونوں کو بالکل صحیح مان بھی لیا جائے) ایک ہی ہستی کے اندر متوازی جاری رہنا کیونکر تسلیم کیا جاسکتا ہے، (اٹھارہویں صدی کے مشہور جرمن مفکر لائبنٹز[1] نے اس متوازیت کا حل یوں کیا تھا، کہ خدا نے ازل سے مادہ اور روح، یعنی میکانکی اور غایاتی سلسلوں کو دو گھڑیوں کی طرح ہم آہنگ کر دیا ہو اور اس ازلی چابی کی وجہ سے وہ متوازی جا رہے ہیں، حالانکہ ان کے طریقے مختلف، زبان مختلف اور چال مختلف ہے، مشکل کا یہ حل سائنسدان کے لئے کوئی آسانی پیدا نہیں کرتا، سائنس داں حوادث کو دیکھتا ہے، اور سائنس حادث معلولوں کی حادث علتوں سے توجیہ کرتی ہے، مانا کہ خدا نے ازل سے ان دو سلسلوں کو ہم آہنگ کر دیا، لیکن کیسے؟ جب تک اس کیسے کی مفصل توجیہ نہیں ہوتی، مشکل کا حل نہیں ہوتا،

کیا اس سے یہ بہتر نہیں ہے، کہ ان دو سلسلوں کی نوعیت اور حقیقت کی بحث کو چھوڑ دیا جائے اور صرف اُس باہمی تعامل اور تفاعل کو بیان کیا جائے، جو امر واقعہ ہے، اور جس کا ہر شخص کو مشاہدہ ہے؟

[1] Leibnitz.

تفاعلیت یہی چاہتی ہے، اور یہ طریق کار نہ صرف صحیح علمی مواد کے جمع میں بیحد مفید ہوگا، بلکہ علمی دیانت کا تقاضا بھی یہی ہے، کہ اس منزل کو پہلے طے کیا جائے، پھر مابعد الطبیعیاتی نظریوں میں الجھا جائے، اگر میکانیت اور غائیت کی مابعد الطبیعیاتی بحث میں الجھنا ہی ہے، تو پھر کیون نہ ہم اُس نظریہ کو زیادہ اہم سمجھ کر قبول کریں، جو ان دو میں سے زیادہ جامع ہے؟ مثلاً بعض مفکروں کی رائے یہ ہے، کہ غائیت سے میکانیت کی توجیہ ہو سکتی ہے لیکن میکانیت سے غائیت کی عقدہ کشائی نہیں ہوتی، اسلئے غائیت (اور تفاعلیت یہان ہم آہنگ ہے) کا قبول علمی و منطقی لحاظ سے زیادہ صحیح ہے،

۱۳- تفاعلیت اصولاً سائنس کے کسی بنیادی قانون یا اولیہ کی خلاف ورزی نہیں کرتی، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مشاہدہ کی حد سے آگے نہیں بڑھتی، اور نہ متوازیت کی طرح وہ کوئی ایسا نظریہ ہی اختراع کرتی، یا ایسا دعویٰ کرتی ہے، جس کے حق میں نہ مشاہدہ پیش کیا جا سکتا ہے، اور نہ کوئی صحیح دلیل، اس لئے طریقِ کار کی حیثیت سے تفاعلیت اپنے اندر ایسی وسعت رکھتی ہے، کہ بالکل مختلف الخیال مفکر بھی اس کے دائرے کے اندر رہ کر اپنی تحقیق جاری رکھ سکتے ہیں،

اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں، کہ متوازیت نفسی و عضوی محققین کے درمیان تقسیمِ کار کی غرض سے شروع ہوئی، مثلاً انسان ایک نہایت پیچیدہ ہستی ہے، نفسی کہتا ہے کہ میں اپنا وقت ذہنی حالات کی تحقیق میں صرف کروں گا، عضوی کہتا ہے کہ میں اسی انسان کی بدنی اور عصبی حیثیت کی تحقیق کرونگا، یہ تقسیمِ کار محض ایک منہاجی تدبیر کی حیثیت سے ہے، اس سے انسان کے جسم اور ذہن میں ایسا فرق مقصود نہ تھا، کہ دونوں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے الگ الگ تسلیم کر لئے جائیں، متوازیت کی بنیادی غلطی یہی ہے کہ اس نے ایک عارضی اور منہاجی تقسیمِ کار کو ابدی اور قطعی اہمیت دیدی ہے، ورنہ نظر انصاف سے اگر دیکھا جائے تو شاید ذہن کی ہر حالت جسم و مغز کی کسی حالت سے وابستہ ہوتی ہے، اور جسم کی اکثر حالتیں (اور کوئی تعجب نہیں، کہ شروع میں جسم کی تمام حالتیں) کسی نہ کسی نفسی یا ذہنی حالت سے وابستہ ہوتی

ہیں نفسی اپنی سہولت کے لئے بعض اوقات جسمی یا مغزی حالتوں کو نظرانداز کر دیتا ہے، اسی طرح عضوی اپنی سہولت کے لئے بعض اوقات یا اکثر اوقات ذہنی یا نفسی حالتون کو نظرانداز کر دیتا ہے، لیکن اس نظراندازی سے ان حالتون کی عدم واقفیت لازم نہیں آتی، مثلاً اگر کوئی شخص رنگوں کی تحقیق میں مصروف ہے تو وہ ان کے اقسام، ان کے باہمی تعلقات اور ان کی نوعیت وحقیقت پر اپنا وقت صرف کرتا ہے، وہ اس حقیقت کو نظرانداز کر دیتا ہے، کہ جو رنگ بھی دنیا میں موجود ہے، وہ کسی سطح یا جگہ یا شے میں ہے، مثلاً کسی کپڑے یا پتے، پھول یا جانور یا کاغذ یا ہوا یا پانی یا کسی اور چیز میں ہے، رنگ کا وجود بغیر سطح و جگہ و شے کے ممکن نہیں، لیکن اس محقق نے اپنے لئے جو کام مخصوص کر لیا ہے، وہ صرف رنگ بحیثیت رنگ کے مقام سے اُسے کوئی غرض نہیں لیکن اس کا وہ انکاری بھی نہیں، البتہ اُسے صرف اس مقام سے دلچسپی نہیں ہے، یہی حالت جسم و نفس، یا مغز و ذہن کے تضاد کی ہے، یہ تضاد صرف علمی تحقیق و تجسس کی سہولت کی غرض سے قائم رکھا گیا ہے، ورنہ علمی حیثیت سے کوئی اس حقیقت کا انکار نہیں سکتا، کہ ایک ہی ہستی میں یہ دو حالتیں بیک وقت موجود ہیں،

متوازیت کے نظریہ کو اگر صحیح مان لیا جائے، تو نفسی حیثیت سے ہمارے لئے ناممکن ہو جائے گا کہ انسانی عزم و ارادہ، انسانی خود اختیاری اور قوتِ تمیز و انتخاب کی صحیح توجیہ کر سکیں، ہمیں ان نفسی حالتوں کا انکار کرنا پڑے گا، اور بعض مادیین نے (مثلاً کرداریت والون نے) سچ مچ انکار کر دیا ہے، انہی نفسی حالتوں پر اخلاقیات اور تمام مدنی علوم کا انحصار ہے، ظاہر ہے کہ جو شخص انسان کو ارادہ اور تمیز سے محروم سمجھتا ہے، وہ اُسے کسی اخلاقی کمزوری یا برتری کا ذمہ دار یا حامل بھی نہیں سمجھ سکتا، تفاعلیت اس الزام سے بری ہے، وہ انسان کی ہر حالت کو امر واقعہ سمجھ کر لیتی ہے، اور چونکہ ہم میں سے ہر ایک کا ذاتی مشاہدہ اور تجربہ گواہی دیتا ہے، کہ ہم مختلف راستوں میں سے کسی ایک کو اختیار کر سکتے ہیں، مختلف چیزوں میں اپنی ضروریات اور خواہشات کے مطابق انتخاب کر سکتے ہیں، اور بدی اور نیکی کرتے وقت اپنے

آپ کو ذمہ دار محسوس کرتے ہیں، اس لئے اس نظریہ کے مطابق احساس ذمہ داری اور اخلاقیات اور علوم مدنی، دونوں کی صحیح توجیہ ہوتی ہے اور معقولیت ثابت ہوتی ہے (۱۴) اس بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ،

(۱) انسان ایک مختلف الحیثیات اور مرکب ہستی ہے، جس میں جسمیت بھی ہے اور نفسیت بھی (حیوان میں بھی یہ دونوں حیثیتیں پائی جاتی ہیں، اگرچہ ادنیٰ درجہ پر)

(۲) یہ امر واقعہ ہے، کہ ان دو اہم حیثیتوں میں (جو خود بھی نہایت پیچیدہ ہیں) باہمی تعامل جاری ہے

(۳) ان دو اہم حیثیتوں کی دو خاص صورتوں یعنی ذہن و مغز میں نہایت گہرا اور پیچیدہ تعلق ہے اور مشاہدہ بتاتا ہے کہ ایک کا دوسرے پر اثر ہوتا ہے، نظریہ تفاعلیت اس باہمی تعامل کو امر واقعہ مان کر ثابت کرتا ہے کہ اس اقرار سے کسی معلوم قانون قدرت کا (جو علمی دنیا میں محقق ہو) تناقض لازم نہیں آتا،

(۴) اس کے برعکس نظریہ متوازیت ذہن و مغز کے اس باہمی تعامل کو امر واقعہ نہیں بلکہ محض ایک غلطی یا غلط فہمی تصور کرتا ہے، اس نظریہ کا دعویٰ ہے کہ ذہنی اور مغزی حالتیں الگ الگ سلسلوں میں متوازی حیثیت سے جاری ہیں، لیکن ہم دیکھ چکے ہیں، کہ یہ نظریہ ہر لحاظ سے ناقص ہے، اس سے معلوم اور محقق قوانین قدرت کی تنقیض بھی لازم آتی ہے، اور کوئی خاص فائدہ بھی اس سے حاصل نہیں ہوتا،

(۵) یہ بھی اوپر گذر چکا ہے کہ حیاتیات، نفسیات، اخلاقیات اور جملہ مدنی علوم ترقی نہیں کر سکتے، اگر ہم متوازیت کے نظریہ کو صحیح مان لیں، ان علوم کے لئے تفاعلیت کا نقطۂ نظر بہترین ہے،

۱۵- کیا تفاعلیت سے بہتر نظریہ ممکن نہیں؟

فصل نمبر ۱ میں ہم نے دو سوال سامنے رکھے تھے جسم و نفس سے مراد کیا ہے، اور ان کا باہمی تعلق کیسا ہے؟ متذکرہ بالا بحث تمام تر انہی دونوں سوالات سے متعلق تھی، یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ان دو سوالات کا آخری قطعی اور ناقابل تغیر جواب ابھی ممکن نہیں، فصل نمبر ۵ میں بتایا گیا تھا، کہ انسان مرکب ہے چھ قسم کے عملوں سے طبیعی، کیمیاوی، حیاتی، نفسی، شعوری، اور روحانی، ان میں سے پہلے تین عملوں کو ہم نے خارجی یا جسمی کہا تھا، (اس

وجہ سے کہ ان کا ہر شخص مشاہدہ کر سکتا ہے) اور پچھلے تین عملوں کو داخلی یا ذہنی، یہ داخلی عمل بلا واسطہ اور مستقیم طور پر صرف اُس شخص کے مشاہدہ میں آسکتے ہیں، جس کے (ذہن کے) وہ عمل ہوں، دوسرے اشخاص کیلئے ان کا ادراک محض بالواسطہ ہوگا، خارجی عملوں سے انسان کا جسم بنتا ہے اور داخلی سے اس کا ذہن یا نفس، جسم و ذہن کا باہمی تعلق کیا ہے، اس سوال سے مراد صرف یہ ہونا چاہئے، کہ ان داخلی اور خارجی عملوں کا باہمی تعلق کیا ہے، یہ ہم نے دیکھ لیا ہے کہ ان داخلی اور خارجی عملوں میں واقعی اور اہم تعلق ہے، لیکن اس سوال کا جواب ابھی ہمارے پاس موجود نہیں ہے کہ یہ تعلق کس نوعیت کا ہے اور کیسے جاری رہتا ہے، جدید سائنس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جسے مادہ کہتے ہیں وہ محض قوت ہے اور قوت کہتے ہیں کام کرنے کی قابلیت کو، مادہ بحیثیت ایک جامد اٹل اور غیر متغیر چیز کے جو نفس اور ذہن کا نقیض سمجھی جاتی تھی، غیر حقیقی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مادہ کی جامد حالت اس کی ابتدائی حالت نہیں، بلکہ آخری حالت ہے جسم زندہ ہے اور ذی حیات ہونے کی حیثیت سے اس میں ایسے عمل ہوتے ہیں، جو اس کے مردہ ہو جانے کی حالت میں (جبکہ وہ مادہ کی نسبتہً جامد حالت میں بدل جائے گا) ممکن نہیں، یہ حیات کیا چیز ہے، جس کی وجہ سے مادہ جسم بنجاتا ہے اور جس کی غیر موجودگی سے جسم مادہ بن جاتا ہے، اور جس کی بعض حالتوں میں نفس و ذہن و شعور و ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے، اس سوال کا جواب ابھی سائنس کے پاس موجود نہیں ہے، یہاں صرف ایک بات کو ذہن نشین کر لینا چاہئے، کہ ہم میں سے کسی نے بھی اپنے نفس کو جسم کے بغیر نہیں دیکھا، اور اپنے جسم کو نفس کے بغیر نہیں دیکھا، ہم کیا ہیں؟ شخصیت اور شخصیت کو ہم محض سہولت مطالعہ کے لئے نفس اور جسم کی مبہم اور پیچیدہ حیثیتوں میں تحلیل کر دیتے ہیں،

معارف: علم نفس اور علم حیات کی ترقیاں جس حد تک بھی پہونچیں وہ جو کچھ جواب دے سکی ہیں وہ کیسے (کیف) کا ہے کیوں (لم) کا نہیں اور اس راز پر جو پردہ قل الروح من امر ربی وما اوتیتم من العلم الا قلیلا (کہدو کہ روح میرے پروردگار کے امر سے ہے اور (اے انسانو) تمکو علم نہیں بخشا گیا، مگر تھوڑا) کا پڑا ہے وہ اب تک نہ اٹھا، اور نہ اٹھنے کی امید ہے،

فتوح السلاطین

از

سید صباح الدین عبدالرحمن (علیگ) رفیق دارالمصنفین

(۵)

گجرات کی بغاوتیں

گجرات کی بغاوتوں کا حال عصامی نے بہت ہی تفصیل سے لکھا ہے، اس کا بیان ہے کہ قتلغ خان کی معزولی کے دو برس بعد گجرات میں جونبال، قاضی جلال، جلال ابن لالہ اور جھلو افغان شاہی افسر مقبل کے ظلم و ستم سے عاجز ہو کر بردوہ میں جمع ہوئے، اور اس سے انتقام لینے کی قسم کھائی، مقبل کو خبر ملی تو ان کی طرف فوج لیکر بڑھا، مرتکج ؟ میں وہ مخالف فوج سے رزم آرا ہوا، مگر شکست کھا کر ٹمن کے قلعہ میں پناہ لی، مذکورۂ بالا چاروں گجراتی امراء فاتح و کامران ہو کر کھنبایت پہنچے، اور وہاں کے شحنہ طغی کو اپنا مطیع بنایا، لیکن وہ ان سے برگشتہ ہو کر مقبل سے پٹن میں جا ملا، مگر گجراتی امراء کے ایک ساتھی مبارک نے اس قلعہ کو بھی فتح کر لیا، دو مہینہ کے بعد دھار کا حاکم عزیز خمار مالوہ سے لشکر لیکر ان کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوا، مقبل نے بھی اس کا ساتھ دیا، گجراتیوں کے پاس صرف سات سو سوار، اور شاہی فوج میں چھ ہزار سوار تھے، جنگ شروع ہوئی، عصامی نے لڑائی کی تفصیل حسب معمول پورے رزمیہ انداز میں لکھی ہے، شاہی فوج پسپا ہو کر بھاگی، عزیز خمار زندہ گرفتار ہوا، اور مارا گیا، دوسرے روز یہ فوج (جس کو عصامی لشکر بردوہ کہتا ہے) کھنبایت میں داخل ہوئی، لیکن وہاں کے باشندوں نے ان کی اطاعت کرنا پسند نہیں کیا، لشکر بردوہ ان کی سرکوبی

میں مشغول تھا، کہ طغی ان کی مدد کو آگیا، پھر دونوں طرف سے تین چار مہینے تک کشت و خون جاری رہا،

برنی کی تفصیلات عصامی سے کچھ مختلف ہیں، اس نے ان بغاوتوں کو گجرات کی ایک غیر ملکی جماعت امیر صدگان کی طرف منسوب کیا ہے، یہ امیر شاید سو سواروں کے عہدہ دار ہوتے تھے جو ضلع یا پرگنہ کا انتظام کیا کرتے تھے، یہ اصطلاح یحییٰ، فرشتہ، نظام الدین اور بدایونی بکثرت استعمال کرتے ہیں، لیکن ابن بطوطہ اور عصامی نے اس کو کہیں استعمال نہیں کیا ہے، برنی یحییٰ اور فرشتہ وغیرہ قاضی جلال، جونبال وغیرہ کے نام نہیں لیتے ہیں، البتہ سفرنامہ ابن بطوطہ میں قاضی جلال اور جلول (شاید جھلو مراد ہو) کے نام مذکور ہیں،

بغاوت کے اسباب کے سلسلہ میں برنی نے لکھا ہے، کہ سلطان محمد تغلق کو خبر ملی، کہ قتلغ خاں کے کارکن شاہی آمدنی میں زیادہ تر غبن کر لیتے ہیں، تو اس نے دکن کو چار شقوں (اضلاع) میں تقسیم کیا و ہر شق ایک امیر کی نگرانی میں دیا، ایک شق میں ملک سرو فاندار، دوسرے میں مخلص الملک، تیسرے میں یوسف بغرا، چوتھے میں عزیز خمار کو مامور کیا، اور عماد الملک کو دیوگیر کا وزیر بنایا، ان میں سے ہر ایک کو ہدایت کی، کہ امیر صدگان کی ہر ممکن صورت سے سرکوبی کی جائے، کیونکہ اس کا خیال تھا، کہ فتنہ و فساد ان ہی کی وجہ سے ہوتا ہے، اس کے بعد قتلغ خان کو دہلی بلالیا، اور عزیز خمار کو مالوہ کا حاکم بنا کر دھار بھیجا، دیوگیر میں قتلغ خاں کا بھائی نظام الدین جانشین ہوا، عزیز خمار دھار پہونچا، تو اس نے امیر صدگان کو ایک روز دعوت دی اور ان میں اسی امراء کو اپنے محل کے سامنے قتل کرا دیا، یہ واقعہ ایسا نہ تھا، کہ اس جماعت کے لوگ خاموش رہتے، اسی کے بعد گجرات کا نائب وزیر ملک مقبل اپنے صوبہ کا خزانہ لیکر دہلی چلا، بردوہ اور دبھوی (صحیح لفظ ڈبھوئی ہے جو اب تک بردوہ سے اٹھارہ میل جنوب میں واقع ہے) کے بیچ میں اس نواح کے امیران صدہ نے مقبل پر حملہ کیا، اور اس کا تمام مال و اسباب لوٹ لیا، ملک مقبل نہروالہ واپس ہو گیا، امیران صدہ

میں بغاوت کی آگ ہر جگہ پھیل گئی، اور وہ اکٹھا ہو کر کنبھائت کی طرف بڑھے،

عصامی اور برنی کی کے مذکورۂ بالا بیانات میں اختلاف سے ہے، عصامی کے یہاں ملک مقبل کی تصویر زیادہ نمایاں ہے، اس کا بیان ہے کہ ملک مقبل گجراتی امرا پر خود حملہ آور ہوا، وہ امیر صدگان کی جماعت کے امرار کے قتل کا بھی ذکر نہیں کرتا ہے، عزیز خمار اور امیر صدگان کی جنگ کا حال برنی نے صرف دو تین سطروں میں لکھ کر ختم کر دیا ہے، مگر عصامی نے پوری تفصیل سے بیان کیا ہے،

برنی رقمطراز ہے کہ سلطان محمد کو ان بغاوتوں کی خبر ملی، تو انتہائی غیظ و غضب میں دار الخلافت سے دکن روانہ ہوا، روانگی کے قبل گجرات کی نیابت شیخ علاؤ الدین اجودھنی کے لڑکے شیخ معز الدین کے سپرد کی، اور تین لاکھ تنکہ دیکر دو تین دن کے اندر ایک ہزار سوار مرتب کرنے کا حکم دیا، وہ کوچ کر کے سلطان پور پہونچا، جو دہلی سے پندرہ کوس پر واقع تھا، یہاں اس کو عزیز خمار کے پسپا ہونے اور مارے جانے کی خبر ملی، عصامی کا بیان ہے کہ سلطان محمد دہلی سے روانہ ہوا، تو اس کے مظالم سے فوج پریشان، عاجز اور فاقہ مست ہو رہی تھی، اس لئے تیزی سے کوچ نہ کر سکی، آخر اس نے ناگور پہونچ کر اعظم ملک کو بھروچ کی طرف روانہ کیا، اعظم ملک نے بھروچ کے قلعہ پر قبضہ کر لیا، تو باغیوں کی فوج نے قلعہ پر یلغار کیا، گو ان کے پاس کل سات سو سوار تھے، مگر جنگ شدت کی ہوئی، آخر شاہی فوج نے قلعہ سے باہر نکل کر لڑنا شروع کیا، باغیوں کا سردار جھلو مارا گیا، اور جو رنبال اور قاضی جلال فرار ہو کر ایک ہندو راجہ مانڈیو کے یہاں پناہ گزین ہوئے، مگر وہ ہمدرد ثابت نہ ہوا، بلکہ ان کے مال و اسباب کو لوٹ کر سلطان محمد کے حوالہ کر دینا چاہا،

برنی کی تفصیل میں تھوڑا سا فرق ہے وہ لکھتا ہے، کہ سلطان محمد سلطان پور سے کوچ کر کے نہروالہ کے پاس پہونچا، شیخ معز الدین کو نہروالہ بھیجکر خود ابو پہاڑی کی طرف بڑھا، جہاں سے بڑودہ اور ڈبھوی نزدیک تھے، یہاں سے باغیوں کی سرکوبی کے لئے فوج بھیجی، باغی مقابلہ کی تاب

نہ لا سکے اور شکست کھا کر دیوگیر کی طرف بھاگے، بادشاہ ابو سے بھروچ آیا، اور مفرورین کے تعاقب میں نائب وزیر ممالک ملک مقبول کو دہلی کی فوج اور بھروچ کے امیران صدہ کے ساتھ بھیجا، ملک مقبول نربدا تک تعاقب کرتا ہوا گیا اور باغیوں کی پوری سرکوبی کی، ان کے بعض ممتاز امرار (نام نہیں درج ہیں) سالیر اور مالیر کے حاکم مانڈیو (فرشتہ بگلانہ کا حاکم لکھتا ہے) کے یہاں جا کر پناہ گزیں ہوئے، ملک مقبول کچھ دنوں نربدا کے ساحل پر مقیم رہا، اور شاہی فرمان کے بموجب بھروچ کے ہمراہی امیران صدہ کو تہ تیغ کر دیا، جو قتل سے محفوظ رہے وہ دیوگیر بھاگ گئے،

اس کے بعد برنی کا بیان ہے کہ سلطان بھروچ میں مقیم رہا، بھروچ اور گجرات کی مالگذاری وصول کی، باغیوں کو اچھی طرح سزا دی، اور زین بندہ اور رکن تھانیسری کے منجھلے لڑکے کو دیوگیر کی بغاوت کے اسباب کی تفتیش کے لئے مقرر کیا، مگر یہ دونوں اپنی فتنہ پردازی اور شر انگیزی کے لئے مشہور تھے، اس لئے عام طور سے ان کی اس خدمت پر نفرت کا اظہار کیا گیا، اسی اثنا میں سلطان نے قتلغ خان کے بھائی نظام الدین کے پاس دو امیر (نام مذکور نہیں) بھیجکر فرمائش کی کہ پندرہ سو سوار اور ممتاز امیران صدہ اس کے پاس بھیجے جائیں، نظام الدین نے حکم کی تعمیل کی، مگر یہ دونوں امیر سوار اور امرار کو لئے جا رہے تھے، کہ راستہ میں امیران صدہ نے بغاوت کی، اور دونوں کو قتل کر دیا اور دولت آباد واپس آکر نظام الدین کو قید اور تھانیسری کے لڑکے کو تہ تیغ کر دیا، اس کے بعد ایک امیر مخ افغان کو بادشاہ تسلیم کر کے مرہٹوں کی مملکت کو آپس میں تقسیم کر لیا، بڑودہ اور ڈبھوئی کے امیران صدہ جو مانڈیو کے یہاں پناہ گزیں تھے، آکر ان سے ملے، ان بغاوتوں کا حال سن کر سلطان محمد دیوگیر پہونچا، جہاں باغیوں نے اس کا مقابلہ کیا، لیکن ان کو شکست ہوئی، مخ افغان اپنے اہل و عیال کے ساتھ دھارگیر کے قلعہ میں جا چھپا، حسن گانگو، بدر کے باغی اور مخ افغان کے بھائی اپنے اپنے ملکوں کو فرار ہوئے، سلطان نے عماد الملک سرتیز سلطانی کو گلبرگہ روانہ کیا،

تاکہ وہ اس علاقہ پر قابض ہوجاتے، اور خود دیوگیر میں ٹھہرا، اسی اثنا میں گجرات میں طغی نے علم بغاوت بلند کیا، بادشاہ جلد گجرات کی طرف روانہ ہوگیا، اور اس بغاوت کو فرو کرنے میں مشغول تھا، کہ اس کو خبر ملی، کہ حسن گانگو نے سرتیز سے جنگ کرکے اس کو قتل کر دیا ہے، اور قوام الدین ملک جوہر اور ظفر الجیوش دیوگیر چھوڑ کر دھار میں پناہ گزین ہیں، اور حسن گانگو دیوگیر کا بادشاہ بنا بیٹھا ہی سلطان پیچ و تاب کھا کر رہگیا،

عصامی نے ان واقعات کو برنی سے زیادہ تفصیل کیساتھ لکھا ہی جو محض موازنہ کے لئے ذیل مین درج ہے،

شاہی فرمان کے بموجب عالم ملک نے ایک فوج احمد لاچین کی قیادت میں بادشاہ کے پاس بھیجی، اس فوج کے ساتھ کچھ امراء تھے، جن مین نور الدین اور اسمٰعیل نمایاں تھے، انھون نے اپنے کو خطرے میں محسوس کرکے راستہ میں بغاوت کی[1]، اور احمد لاچین قلتاش اور حسام کو تہ تیغ کرکے دولت آباد آئے، عالم ملک نے ان کا مقابلہ کیا، لیکن وہ زندہ گرفتار ہوگیا، اس کے بعد باغیوں نے ستارہ کا محاصرہ کیا، اور فتح حاصل کی، نصرت و کامرانی کے نشہ سے مخمور ہوکر انھوں نے اسمٰعیل کو اپنا بادشاہ بنایا، اسمٰعیل حسن (یعنی حسن گانگو) کو بادشاہ بنانا چاہتا تھا، لیکن وہ اس وقت ان سے دور دراز مقام پر تھا، اس لے مصلحۃً اسمٰعیل کو بادشاہ بنالیا گیا، اور اس کا لقب ناصر الدین ہوا، نور الدین خواجہ جہاں کے لقب سے سرفراز کیا گیا، اس بادشاہت کے اعلان کے بعد قاضی جلال اور مبارک مفتی جو راجہ مانڈیو کے یہاں پناہ گزین تھے، بلائے گئے، جلال کو قدر خان اور مبارک کو خان کا خطاب عطا کیا گیا،

دو مہینہ کے بعد نور الدین نے الغ خان اور بہرام افغان کو لیکر گلبرگہ کی طرف یلغار کی، گلبرگہ

[1] فرشتہ کا بیان ہی کہ یہ بغاوت درہ مانک سے کے پاس ہوئی، جو بیچ اور دون کے درمیان واقع ہی

مین ایک ہندو کھتری کندھرا نے مسلمانوں پر بڑے مظالم کئے تھے، نور الدین کے ایک ہی حملہ میں وہ پسپا ہوگیا، لیکن اوس نے کلیان کے حاکم جلال دوہنی سے مدد مانگی، اور وہ اس کی مدد کو کلیان سے روانہ ہوا جلال دوہنی کو راستہ میں روکنے کے لئے حسین ستیہ مامور ہوا، دونوں میں جنگ ہوئی جلال دوہنی مارا گیا، اور حسین ستیہ فتحیاب ہوا،

ان واقعات سے متاثر ہوکر حسن نور الدین کی مدد کے لئے اپنی مملکت سے گلبرگہ کی طرف بڑھا، اسکو یلغار کرتے ہوئے دیکھکر بدر اور سگر کے حاکموں نے بھی مدد پہونچائی، ناصر الدین بیحد خوش ہوا، اور حسن کو ظفر خان کے خطاب سے سرفراز کیا، گلبرگہ کے محاصرہ کی جنگ میں شدت پیدا کی گئی، اور جب یہ فتح ہونے کے قریب تھا، تو ناصر الدین نے اس فوج کے سرداروں کو طلب کیا، انھون نے جانا پسند نہ کیا تو ظفر خان خود دولت آباد روانہ ہوا، اسی اثنا میں گلبرگہ کے حصار میں غلہ کی کمی ہوگئی، اور محصورین نے سپر ڈال دیا،

محمد بن تغلق اپنے شاہی حاکموں کی ہزیمت اور شکست سے پیچ و تاب کھا کر دیوگیر کی طرف روانہ ہوا، اور ستارہ پہونچکر اپنی فوج کو جنگ کے لئے ترتیب دیا، قلب میں تاتار خان، یسار میں مقبول، اور میمنہ میں خود بادشاہ کھڑا ہوا، ناصر الدین کے لشکر میں قلب میں اس کا لڑکا خضر خان، خان جہان حاتم خان وغیرہ، میمنہ مین قدر خان و مبارک خان، میسرہ میں ظفر خان اور حسام الدین مامور ہوئے عصامی نے جنگ کی تفصیل حسب معمول پورے رزمیہ انداز میں لکھی ہے محمد تغلق کے ہاتھون نے دشمنون کی فوج میں انتشار پیدا کر دیا، اور وہ منتشر ہوکر فرار ہوگئی، ناصر الدین دیوگیر کے قلعہ میں آکر پناہ گزین ہوا، اسی اثنا میں گجرات میں طغی باغی ہوگیا، تغلق اس بغاوت کو خطرناک سمجھکر طغی کی سرکوبی کے لئے خود چلا، اور سرتیز کو گلبرگہ کی طرف روانہ کیا، دولت آباد میں تغلق کے ایک فوجی سردار جوہر نے وہان کے مسلمانون پر سخت مظالم کرکے ناصر الدین، خضر خان، خان جہان، تاتار خان، قدر خان، مبارک خان،

صفدر خان، بہار الدین حاجب، اور نصیر تغلچی کو گرفتار کر لیا،

ظفر خان آزاد رہا، اور اس نے دیوگیر سے مرج کی طرف کوچ کیا، یہاں پہونچکر اس نے فوج کو از سر نو ترتیب دینے کی کوشش کی، سکر کے فوجدار سکندر خان اور قیر خان نے اس کا ساتھ دیا، سرتیز گلبرگہ پہونچا، اور وہاں سے کوچ کرتا ہوا ظفر خان کے مقابلہ میں آیا، ظفر خان بھی اپنی فوج لیکر گوداوری کے پاس پہونچا، اور ایک فوج حسین کی سرکردگی میں بطور مقدمۃ الجیش بھیجی، حسین اور سرتیز کی فوجوں میں بمقام کھیڑہ ڈبھیڑ ہوئی، سرتیز نے مبارک کو حسین سے نبرد آزمائی کے لئے مقرر کیا، مگر وہ پسپا ہو کر بیر کی طرف فرار ہو گیا، مقدمۃ الجیش کی نصرت و کامرانی کی خبر پاکر ظفر خان کہتی ھو، ہوتا ہوا سندھتن پہونچا، یہاں سرتیز سے گھمسان لڑائی ہوئی، سرتیز مارا گیا، ظفر خان فتح یاب ہو کر دولت آباد پہونچا، اس کی آمد کی خبر سنتے ہی جوہر دھار کی طرف فرار ہو گیا، اور ظفر خان نے ناصر الدین کو قید سے آزاد کیا، ناصر الدین نے ظفر خان کی موجودگی میں پھر بادشاہ بننا پسند نہیں کیا، اور اس کے حق میں بادشاہت سے دست بردار ہو گیا،

ظفر خان عصامی کا ہیرو ہے اسلئے اس کی فتح و کامرانی جرأت و شجاعت اور آخر میں ناصر الدین کا اسکے حق میں بادشاہت سے دست بردار ہونے کو بہت ہی عقیدتمندانہ انداز میں لکھا ہے،

اسکے بعد عصامی نے سلطان علاؤ الدین بہمنی کی حکومت کے واقعات لکھنے شروع کر دیے ہیں، وہ اس کا درباری شاعر تھا، لہذا اس عہد کے جتنے واقعات اس نے قلم بند کئے ہیں، وہ صحیح اور مستند ہیں، اور بعد کے موٗرخوں کے لئے شاید واحد اور معتبر ماخذ ہے، برہانِ مآثر میں واقعات کی ترتیب اور تفصیل بالکل اس سے ملتی جلتی ہے،

طغی کی بغاوت کے مختصر ذکر کے بعد فتوح السلاطین کے تاریخی واقعات ختم ہو جاتے ہیں، بغاوتوں کے سلسلہ میں عصامی نے ہانسی اور سرستی کے حاکم سید ابراہیم خریطہ دار اور کرہ کے حاکم

نظام مائیں ۳۰-۳۷ھ کی سرکشی کا حال نہیں لکھا ہے، خلیفہ بغداد کے یہاں سے خلعت کی آمد کا بھی وہ ذکر نہیں کرتا ہے، حالانکہ اس عہد کا یہ مشہور واقعہ ہے، اُس نے محمد تغلق کی علمی سرپرستی علمی فیاضی اور علمی تبحر کی طرف بھی مطلق اشارہ نہیں کیا ہے، بلکہ اس کی شان میں ہمیشہ سخت اور بُرے الفاظ مثلاً ظالم، سفاک، خونریز، بیدادگر، بدخواہ دین، اور دُون پرور وغیرہ استعمال کیا ہے، ایک جگہ لکھتا ہے،

شہنشاہ دون دُوست بدخواہ دین — کہ یکسر بہ تافت از راہ دین
شد آزردہ از روے صغار و کبار — بر گشتہ جائز خروجِ دیار
شریعت رضا داد در خونِ او — طبیعت فسردہ ز افسونِ او
بخونش روان گشتہ حکم قضاۃ — قضا بستہ بر وے طریقِ نجاۃ
ز آئینِ اسلام سر تافتہ — ابا زمرۂ کفر دریافتہ
بر انداختہ رسمِ بانگِ نماز — شب و روز از و اہلِ دین در گداز
جماعت الجمعہ در انداختہ — ابا ہندواں ہولی باختہ
ابا جوگیاں گشتہ خلوت گرا — بدل راہ کفار را دادہ جا
بر و متفق مفتے کم شدہ — وگر خود شدہ نیز ملزم شدہ
نفیر از خیانش بہر کشورے — بر و حرب جائز بہر محضرے
ہماں شاہ خونخوار ناپاک کیش — شنیدم کہ در آخر ملک خویش
بسے فوج برگشتگاں را نشست — بسے صاحب چتر ش آمد بدست
ہمی کرد ضحاک را اتباع — ہم آخر بر آئین اہل خداع

مگر ظاہر ہے کہ یہ اشعار عصامی کی عصبیت اور جذبات کی شدت اور مبالغہ آمیز طرز بیان کا نتیجہ ہیں، ورنہ تاریخی حقائق کی روشنی میں محمد تغلق کی تصویر اتنی تاریک اور نفرت انگیز نہیں جتنی کہ عصامی

نے دکھانے کی کوشش کی ہے،

اس طویل خامہ فرسائی سے اندازہ ہوا ہوگا، کہ فتوح السلاطین مین تاریخی حیثیت سے مفید اور نئی معلومات بھی ہیں، اور کچھ فروگذاشتیں غیر معتبر اور مبالغہ آمیز واقعات بھی، مجموعی طور سے شاہان دہلی کے حالات کے متعلق تاریخی لٹریچر مین ایک نیا اضافہ ہی، جو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، یہ کتاب اور بھی زیادہ مفید ہو سکتی تھی، اگر اس کے لائق اڈیٹر محنت و کاوش سے اڈٹ کرکے اس پر ناقدانہ حواشی اور تشریحات تحریر کرتے، مگر اڈیٹر مذکور کو اسکی اشاعت میں اتنی عجلت تھی، کہ اس کام کو انجام نہ دیسکے، گو اس کتاب کا ایک علحدہ ضمیمہ اور انگریزی ترجمہ شائع کرنے کا وعدہ کیا ہے، اس کا انگریزی ترجمہ تو شاید سیر حاصل نہ ہو، البتہ اگر ضمیمہ میں عمیق مطالعہ اور نقد و تبصرہ کے ساتھ اس کتاب کی تاریخی فروگذاشتوں اور غلطیوں کو درست کرنے کی کوشش کی گئی، تو اس کتاب سے دلچسپی لینے والے اصحاب کی بہت سی مشکلیں رفع ہو جائیں گی،

فتوح السلاطین کی ادبی حیثیت فتوح السلاطین نہ صرف تاریخی نقطۂ نظر سے قابلِ التفات ہے، بلکہ ادبی حیثیت سے اپنے عہد کی ایک بلند پایہ تصنیف ہی، اس میں سلاطین ہند کی فتوحات کی رزمیہ داستان شروع سے آخر تک بحر متقارب میں لکھی گئی ہی، اس کے مصنف کا اصلی کمال یہ ہی کہ وہ میدان جنگ کی معرکہ آرائی، فوجی سرداروں کی نبرد آزمائی، لشکروں کی صف آرائی کی بہت ہی جیتی جاگتی تصویر کھینچتا ہے، اس سلسلہ میں اس کے بیان کا زور، تحریر کی قوت اور رزمیہ شاعری کا اثر کہین پر ختم ہونے نہیں پاتا، بلکہ ہر جگہ یکساں طور پر قائم رہتا ہے، جو شاعری پر اسکی اعلیٰ قدرت کی دلیل ہی، چنانچہ فتوح السلاطین کو ہندوستانی فارسی کی رزمیہ شاعری کی پہلی مثال اور عصامی کو ہندوستان کے فارسی شعراء میں قابلِ قدر رزمیہ شاعر کہا جا سکتا ہے،

عصامی نے ایک دو موقع پر عشقیہ مضامین بھی لکھنے کی کوشش کی ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہی،

کہ وہ عشق و محبت کے رموز و نکات سے بالکل ناواقف ہے، اس لئے وہ ان کے سچے جذبات کی ترجمانی کرنے کے بجائے سادے طریقے پر صرف ان کی اداؤں اور واردتوں کو بیان کر دیتا ہی، جو محض واقعہ نگاری ہو جاتی ہے، مثلاً خضر خان اور دول رانی کی محبت کے سلسلہ میں جذباتِ عشق کی جان گدازی اور جانسوزی کی شدت بیان کرنے کے بجائے وہ عشق ہی پر ایک حکیمانہ وعظ شروع کر دیتا ہی، اسی سلسلہ مین لیلےٰ و مجنون کے عشق کا بھی حال لکھا ہی، لیکن اس میں کچھ ایسی بے سروپا باتیں لکھدی ہیں، کہ ان کے عشق کے بیان میں کوئی تاثیر پیدا نہیں ہو سکی ہی،

فتوح السلاطین کی سب سے نمایاں خوبی اسکی زبان ہی، شاعر نے شروع سے آخر تک ایک ہی قسم کی زبان اختیار کی ہے، اور کہیں مغلق ثقیل اور نامانوس الفاظ کے استعمال سے اپنے طرز ادا کی خوبی کو مجروح نہیں کیا ہے، اس عہد کے دو ممتاز شاعر اور ہیں، امیر خسرو اور بدر چاچ، ان دونوں سے عصامی کا کوئی مقابلہ نہیں، لیکن الفاظ کی جتنی سادگی اور شستگی عصامی کے یہاں ہے، وہ اسکے معاصرین کے یہاں نہیں ہے، اس کے طرز بیان میں کہیں آورد اور تصنع نہیں ہے، اور نہ کہیں تشبیہات و استعارات سے معانی و مطالب میں پیچیدگی پیدا ہوئی ہے، زیادہ تعجب کی بات تو یہ ہی کہ عصامی نے ہزاروں اشعار کہے اور ہندوستان کے واقعات بیان کئے، لیکن ہندی الفاظ، محاورات اور مصطلحات کہیں نہیں استعمال کئے ہیں، حالانکہ اسی عہد میں برنی اور خسرو اپنی زبان میں بھاشا کے الفاظ قبول کر رہے تھے،

"ریاضِ رضواں"

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

(۲)

تخیل کی رنگینی اور بیان کی شوخی

تخیل کی رنگینی اور بیان کی شوخی شاعری کے عارضِ زیبا کا گلگونہ ہے بغیر اسکے شاعری کا رنگ نہیں نکھرتا، لیکن اسکے لئے بڑے ذوقِ سلیم کی ضرورت ہے، ورنہ اس کا رنگ پھوٹ کر شاعری کے پاک دامن کو داغدار بنا دیتا ہے، جناب ریاض اس دور کے شاعر تھے، جب غیر معتدل رنگینی اور شوخی ہی کمال شاعری تھا، اس لئے ان کے کلام میں تخیل اور طرزِ ادا کی رنگینی اور شوخی کی اتنی بے اعتدالی ہے، کہ اس کی حد پستی و ابتذال تک پہنچ جاتی ہے، لیکن یہ انکے کلام کا نقص نہیں ہے، بلکہ اس دور کے مذاقِ شاعری کا لازمی نتیجہ ہے، لیکن خوشگوار رنگینی کی جو مثالیں ہیں، وہ تخیل کی لطافت، بیان کے لطف اور زبان کی نفاست اور ہلکے پن کے بہترین نمونے ہیں، بعض مثالیں ملاحظہ ہوں،

وہ گل اندام ہو تم ٹوٹتے ہیں تم پر
تم جدھر جاتے ادھر شورِ عنادل ہوتا

خنداں تھوں میں ہونٹوں پر تبسم گدگدی دینے
وہ آئے پھول برساؤ مری پھولوں کی محفل میں

پھولوں کا زیور آج کھلا ان پر اس قدر
تصویر بن گئے ہیں عروسِ بہار کی

ابھی تو خونِ بسمل کچھ یوں ہی سا رنگ لایا ہے
شفق پھولی نظر آتی ہے یارب کون قاتل ہے

انگڑائی لیکے اور بھی سوئے وہ چین سے
پھولوں کی پنکھیاں جو نسیم آکے جھل گئی

نرے نازک سے چہرے پر جہاں رنگِ عتاب آیا
صباحت رُخ کی بول اٹھی کہ رُخ زیرِ نقاب آیا

چلے آتے ہیں خوش خوش کس کے گھر سے
وہ ہنستے کھیلتے بادِ سحر سے

نہ شرماؤ سکھاؤ شوخیاں ہم رن ہیں کم رن ہیں
ذرا یہ منہ بندھی کلیاں ہنسیں بولیں عنادل سے

کسے بتائے کوئی خونِ آرزو کیا ہے
انھیں یہ ضد ہے کہ دیکھیں گے رنگ بو کیا ہے

سرِ تربت نہ سنبھلے گر پڑے پھول
ہیں شرمندہ ہوں دستِ نازنیں سے

اچھی نہیں ہیں آپ کی محشر خرامیاں
دنیا کو اس طرح تہ و بالا نہ کیجئے

وہ پونچھتے ہیں آنسو کیا دستِ حنائی سے
یہ آگ بجھانا ہے یا آگ لگانا ہے،

کبھی آنچل اُڑے اُن کے کبھی زلفیں بکھریں
وہ پریشان ہوئے بادِ سحر سے کیا کیا

نشہ میں جھکی پڑتی ہیں یوں ہی تری آنکھیں
چھیڑوں نہ سے مری اور بڑھا بوجھ حیا کا

باطنی کیفیتیں

شوخی و رنگینی شاعری کے ظاہری خط و خال کا سنگار ہے، لیکن اس کی روح باطنی کیفیتیں ہیں، تخیل کی رنگینی سے شاعری میں لطف تو ضرور پیدا ہوتا ہے، لیکن اس میں بلندی اور تاثیر نہیں آتی، اس کے لئے دل کی جراحت درکار ہے، کہ دل کا ساز اسی مضراب سے بیدار ہوتا ہے، بغیر لذتِ الم کے دل کیفیت سے محروم رہتا ہے، زندگی کی دائمی خوشگواری اور خوش عیشی دل کو مردہ اور روح کو پژمردہ کر دیتی ہے، روح کی کھیتی خونِ آرزو سے لہلہاتی ہو، ع، برق گرتی ہے، تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے،

ریاض طربیہ شاعر ہیں، بزمِ رنداں میں ساغر کے تبسم اور صراحی کے قہقہوں کے سوا سوزِ دل اور زندگی کی گہرائیوں پر غور و فکر کا گذر کہاں اسلئے ان کی شاعری میں خیالات کی بلندی، گہرائی، اور باطنی کیفیتوں کی بڑی کمی ہے، اس سے میری مراد نالہ و شیون اور مرثیہ و ماتم نہیں ہے بلکہ

بلکہ دل کی وہ چوٹ ہے، جس سے چشمِ دل وا، اور روح بیدار ہوتی ہے،

لیکن شاعری دل کے جذبات وخیالات کا عکس ہے، اور ہر انسان کو دنیا کے مختلف نشیب وفراز سے گذرنا پڑتا ہے، پھولوں کی سیج بھی کانٹوں کی کھٹک سے خالی نہیں، شراب کے کیف وسرور کے بعد خمار کا خمیازہ بھی ضروری ہے، حضرت ریاض انسان تھے، ان پر بھی مختلف کیفیتیں طاری ہوتی تھیں، اس لئے ان کی شاعری اس جنسِ گرانمایہ سے بالکل خالی نہیں ہے، اورمے خوشگوار کے چھلکتے ہوئے جام میں کبھی کبھی دو چار گھونٹ تلخ بھی ملجاتے ہیں، گو ریاض کا یہ اصل رنگ نہیں ہے، بلکہ ان کے مذاق کے بالکل ضد ہے، لیکن وہ حقیقی شاعر تھے، اس لئے جس رنگ کی طرف بھی متوجہ ہو جاتے تھے، خوب کہتے تھے، ان کے اس رنگ کے اشعار میں میر کی روح بولتی ہے،

پوچھا کسی نے حال کہ آنسو ٹپک پڑے — رونا مجھے ہے گریۂ بے اختیار کیا،

اب سوئے آسماں نہیں اٹھتا — اپنے دستِ دعا کو روتے ہیں

یادِ ایام و جام باقی ہے، — مے کہاں ہے کا وہ سرور کہاں

مدت ہوئی رسائی قسمت کو رو چکے — وہ سنگِ در کہاں یہ ہماری جبیں کہاں

نہ شگوفہ نہ گل نہ رنگِ بہار — اب تو وحشت کا گھر چمن بھی ہوا

صدقے ترے صیاد یہ باتیں تھیں چمن تک — کچھ فکر بہار اب ہے نہ کچھ فکر خزاں آب

وہ نخل نہ وہ باغ نہ وہ شاخِ نشیمن — اے اہلِ چمن چھوٹ کر اب جائیں کہاں

لہو بھی تو آنکھوں سے آنے لگا ہے — ان آنکھوں کو آنسون سے نم کرتے کرتے

اب دل ہی ریاض اور نہ دل کی وہ تمنا — منجدھار میں ہم کشتی امید ڈبو آئے،

سوکھے ہوئے مرجھائے ہوئے پھول لحد پر — آجاتے ہیں دو چار کبھی اڑ کے ہوا میں

ہم تھک کے گرے گر کے اُٹھے اُٹھ کے چلے بھی — تجھ پر اثر اے دوریِ منزل نہیں ہوتا

دلِ وارفتہ بھی پہلو سے گیا وائے نصیب — نہ رہا کوئی شریک اب غمِ تنہائی کا،

خیالِ یار کے صدقے خیالِ یار ہی ہوگا — تسلی مجھ کو دینے کوئی وقتِ اضطراب آیا

ریاض احساس ہی مجھ کو نہیں ہے — یہ فصلِ گل ہے یا فصلِ خزاں ہے،

تمنائیں بہت ہیں وقت کم ہے، — کسے دیکھوں نگاہِ واپسیں سے

وہ دل ہی نہیں اے ہجومِ تمنا — جدا ہو گیا ہے جرس کارواں سے

دن رات وہی ہیں مگر اللہ رے تغیر — خلوت میں بھی شغلِ مے ومینا نہیں ہوتا

نقش چھوڑے ہوئے تیرے نہیں دیکھے جاتے — عمر رفتہ نہ مرے دل میں تری یاد رہے

نشیمن میں گذرے کئی موسمِ گل — قفس میں جو ٹوٹے تھے وہ پر نہ نکلے

خون تیرے ساتھ تیری آرزوئیں بھی ہوئیں — اے دلِ مرحوم تیرا حادثہ جانکاہ ہے

شمع افسردہ بجھتی ہے، سونی محفل ہوتی ہے — حسرت بیٹھی دل میں اب میری جان توڑتی ہے

لگی آگ میرے جگر میں یوں نہ لگے کسی کے بھی گھر کو یوں — نہ تو لو اٹھی نہ چمک ہوئی نہ شرر اڑے نہ دھواں اٹھا

مٹا ہوں میں مجھ میں کیا رہا ہے حزیں کو تو کیا ستا رہا ہے — تو اے مغنی جو گا رہا ہے تو رو رہا ہے رباب میرا

بیانِ حقیقت جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے عاشقانہ، اور رندانہ اشعار میں سلوک ومعرفت کے اسرار تلاش کرنا کچھ خوش مذاقی نہیں ہے، اس وقت تک اشعار کے ظاہری معنی ہی لینے چاہئیں، جب تک الفاظ یا شعر کا جلال واثر خود باطنی معنی کی شہادت نہ دے، اس میں عموماً بڑی بے اعتدالی برتی جاتی ہے، معنی پرستوں کو مجاز میں بھی حقیقت کا جلوہ نظر آتا ہے، اور ظاہر بین نگاہوں سے حسنِ حقیقت بھی مستور رہتا ہے، جس طرح عاشقانہ اشعار میں تصوف کے معنی پہنانا مضحکہ انگیز ہے، اسی طرح یکسر اس سے انکار بھی کچھ کم بدمذاقی نہیں ہے، جب تسلیم ہے کہ شاعری جذبات کا آئینہ ہے، تو ہر انسان میں سفلی جذبات کے ساتھ

کبھی کبھی علوی جذبات بھی پیدا ہوتے ہیں، کیسا ہی رند شاہد باز کیوں نہ ہو اسکی روح کبھی نہ کبھی عارضی طور سے سہی اصل مرکز کی طرف ضرور متوجہ ہوتی ہے، اور وہ اپنی ہوسناکی کی داستان کی طرح اس کیفیت کو بھی اپنی زبان مین ادا کر دیتا ہے، یہ ضروری نہین کہ کہنے والا صوفی یا اہلِ دل ہی ہو، نظیر اکبر آبادی ناسخ، آتش اور داغ کا کلام بھی ایسے اشعار سے خالی نہیں،

نفس شاعری کی عظمت و بلندی کے نقطۂ نظر سے صوفیانہ تخیل شاعری کی روح ہے، یہ ضروری نہیں کہ ہر شعر میں تصوف کا کوئی نکتہ ہو لیکن مجموعی حیثیت سے کلام بادۂ عرفاں سے خالی نہ ہونا چاہیئے، ورنہ وہ ایک نشۂ بے کیف ہوگا، عارفانہ تخیل سے کلام سدرۃ المنتہیٰ تک پہونچ جاتا ہے، اردو شعراء میں خواجہ میر درد، اثر، غالب اور دوسرے بعض اکابر شعراء کے کلام کی گرمی، اثر و کیف اسی وادی ایمن کی ثمر باریوں کا نتیجہ ہے، اس مرد سالک کی بعض باطنی کیفیتیں اور واردتیں ملاحظہ ہون،

تعین سے منزہ شوخیاں ہیں ان کے جلوہ کی
ہماری وسعتِ دل میں بنا ے لامکاں رکھدی

کتنے کعبے ملے رستے میں کئی طور ملے
ان مقامات سے لیکن وہ بہت دور ملے

تیرے نظارہ نے مجھ کو نہ کہیں کا رکھا
جلوۂ یار کہاں تونے کیا گم مجھ کو،

بیخودی گم گشتگی سکر و تحیر محویت
کچھ مقامات اور بھی پڑتے ہیں مینحانے کے بعد

یہ ہوا ہے خدا خدا کر کے
رات دن بیخودی سی رہتی ہے،

خلوت گہِ دل میں تم چپکے سے جو آجاتے
پردہ میں سویدا کے کیا جانئے کیا ہوتا

نہیں ہے اور کوئی دوسرا سر کو دل میں
ارے تو ہے تیری تمنا نہیں ہے،

چشم و دل ہیں مقامات خلوت کے
آہ پردے پڑے ہیں غفلت کے

حضرت مجذوب فرماتے ہیں،

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی
اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی،

فلک تک لے گئی آہ رسا مجھکو یہ کہہ کر
اب انکا بام آتا ہے اب انکا بام آتا ہے،

اٹھانے نہیں دیتے سر مجھ کو سجدے
کہاں جائیں اٹھ کر ترے آستان سے

خاک کسکی ہے، یہ نقشِ پا کس کے ہین
ناتوان ہم سے جو گرتے ہیں تو سو جاتے ہین

طور سے پہلے بھی دیکھا ہے تجھے
کان ہیں کچھ آشنا آواز سے

تو درونِ خانہ برونِ در تو ہزاروں پردوں میں جلوہ گر
ارے او حقیقتِ پردہ در تری شوخیاں ہیں مجاز میں

تری سجدہ میں وہ مزا ملا کہ تڑپ کے سینہ میں آرہا
کوئی داغ ہے کہ ہے دل مرا یہ مری جبین نیاز میں

کلام ریاض کے عیوب اور اس کی بے اعتدالیان

اوپر جو کچھ دکھایا گیا، وہ کلامِ ریاض کے محاسن اور اس کا دلکش رُخ تھا، تنقید نگاری کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے عیوب پر بھی سرسری نظر ڈال لیجائے، اس سے مراد فنی خامیاں نہیں ہیں، اس لحاظ سے ان کا کلام منزہ عن الخطار ہے، وہ اس دور کے استاد کامل تھے، ان کے کسی شعر میں اس نوع کی کوئی خامی نہیں دکھائی جا سکتی، بلکہ اس سے مراد تخیل و طرزِ ادا کی بے اعتدالی اور اس دور کی شاعری کے دوسرے نقائص ہیں،

ریاض کمال فن کے ساتھ خوش مذاق بھی تھے، لیکن جس دور اور جس اسکول کے وہ شاعر تھے، اس میں تخیل کا ابتذال، جذبات کی عریانی، معاملہ بندی، خارجی اوصاف کی مصوری، الفاظ کی رکاکت، صنائع لفظی اور اس قبیل کی دوسری باتیں شاعری کے حقیقی اجزاء و عناصر بلکہ کمالِ شاعری سمجھی جاتی تھیں، اس لئے ریاض خوش مذاقی کے باوجود ان عیوب سے اپنا دامن نہ بچا سکے، اور کم و بیش ان سب کی مثالیں ان کے کلام میں موجود ہیں، او تخیل اور جذبات کی تو ایسی عریاں تصویریں ہیں، کہ انھیں جلوت کیا خلوت میں بھی دیکھنا مشکل ہے، لیکن تھے وہ خوش مذاق، اس لئے دورِ آخر کی لکھنوی شاعری کی طرح ان کا کلام پھیکا اور بدمزہ نہیں ہونے پایا ہے اور ان خامیوں کے باوجود ان کا قدم شاعری کی دائرہ سے باہر نہیں نکلا ہے، وہ بھکڑ بھی بکتے ہیں تو اس رنگین نوائی کے ساتھ کہ سننے والا

ناگواری کیساتھ ساتھ لطف اندوز بھی ہوتا ہے،

بہرحال اگرچہ یہ ایک ناخوشگوار فرض ہے اور ان کی شاعری کا لطیف و دلکش رُخ دکھانے کے بعد تاریک پہلو دکھاتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے، لیکن اگر اسے قلم انداز کر دیا جائے تو ان کے کلام کا ایک رُخ نگاہوں سے مخفی رہ جائے گا، ان کی شاعری کا یہ رُخ اتنا غیر معتدل ہے کہ اسکی ستھری سی ستھری مثال بھی غالبًا سنجیدہ طبائع پر بار ہوگی، بہرحال اس بدمنظر رُخ کی بھی ایک جھلک دیکھ لیجائے،

تخیل کی پستی اور ابتذال

انکے کلام میں تخیل کی پستی اور ابتذال کی بکثرت مثالیں ہیں نمونۃً صرف چند مثالیں پیش کیجاتی ہیں

سو رہتے ہو روتے نہیں اب جان کو اُنکی
اب غیر کے گھر رات کو ماتم نہیں ہوتا

پاپوش ان حسینوں کی آتی ہے مرے گھر
ان کی نظر میں کچھ میری اوقات بھی تو ہو

دعوت تھی رقیب کی میرے گھر
جوتی میں دال کیا بٹی ہے،

بے طرح ٹوٹتے ہیں دیکھتے ہی دور سے
تم نے اچھا سگِ درباں کو لگا رکھا ہے،

ملجائے جس کسی کو وہی لالوں لال ہے
کیا چیز ان حسینوں کے منہ کا اُگال ہے

ہم کو ملجائیں تو آجائے مزا
اچھے معشوق اور سستے دام کے

لیلیٰ پکاری جامے سے باہر ہوا جو قیس
یہ بے حجابیاں مرے محمل کے سامنے

برابر میری تربت کے کیا ہے دفن دشمن کو
یہ اچھا میرے حصہ میں جہنم کا عذاب آیا

بوسہ لینے میں یہ سمجھے ہم گلوری ہے دبی
گالیاں لاکھوں بھری تھیں پھولے پھولے گال میں

وہ شب کا خواب ہم کو یاد آئے
تمھاری بات کہہ دینگے تم ہی سے

معاملہ بندی اور خارجی مصوری

معاملہ بندی اور خارجی ادھات کی مصوری کی مثالیں اس سے بھی زیادہ عریاں ہیں ناظرین انھیں بھی سن لیں،

مسکی ہوئی محرم ہے کوئی آنکھ نہ ڈالے
آنچل سے چھپالے ارے آنچل سے چھپالے

آنچل ڈھلا رہا مرے مست شباب کا
اوڑھا گیا کبھی نہ ڈوپٹہ سنبھال کے

جو مجھ کو گدگدائے وہ ...... کسی کا ہے
جو تجھ کو گدگدائے وہ میری نگاہ ہے

جوگونج اُٹھی بالوں میں جھنجھلا کے بولے
لگے پیار کو آگ ابھی کان جاتا،

کہنا کسی کا ہائے وہ جھنجھلا کے ناز سے
کمبخت ہاتھ چھوڑ کوئی دیکھتا نہ ہو

تھی آج ہاتھ پاؤں میں مہندی لگی ہوئی
موقع بہت بُرا یہ تری بے کسی کا تھا

مرے ہاتھ سے پہننا انھیں اور بار ہوتا
مگر اور بھی پھبکتی جو گلے میں ہار ہوتا

اڑی ہیکل کو چوم لے گی
وہ چیز جو کچھ اٹھی ہے

انکے آنچل میں ادا بن کر قیامت چھپ گئی
وہ میری جانی ہوئی وہ میری پہچانی ہوئی

اس طرح کہ گھنگرو کوئی چھاگل کا نہ بولے
جب چھم سے چلیں گود میں چپکے سے اٹھالے

ڈر ہے نہ ڈوپٹہ کہیں سینہ سے سرک جائے
پنکھا بھی ہمیں پاس سے جھلنے نہیں دیتے

کہتے ہیں جان پڑ گئی آفت میں روزِ وصل
دل کے رکھ دیا مجھے اچھا یہ پیار ہے

چھپا کر دل کو تم نے رکھ لیا نازک سے محرم میں
بہت نازک ہے شیشہ جس نے کھائی چوٹ پتھر کی

جوانی بھی ہوا کرتی ہے دیوانی مثل سچ ہے
وہ برساتے ہوئے چلتے ہیں پتھر اپنے ...... سے

یہ بت ہاتھ آئیں تو ہیں نرم و نازک
ٹٹولا جوان کو تو پتھر کے نکلے،

یہ اس رنگ کے مہذب سے مہذب اشعار کی مثالیں ہیں،

رعایت لفظی و معنوی

لفظی و معنوی رعایت لکھنؤ کے شعراء کی خاص خصوصیت تھی، وہ اس دھن میں شاعری کی مٹی پلید کر دیتے تھے، ان کی شاعری الفاظ کا گورکھ دھندا ہو کر رہ گئی تھی، ریاض کے یہان بھی اس کی مثالیں ہیں، لیکن ان کی خوش مذاقی ان کا قدم شاعری کے دائرہ سے باہر نہین نکلنے دیتی

چند مثالیں ملاحظ ہون،

دامن کے بدلہ دل کو وہ چوٹی میں دیں جگہ — اب عرش پر تو ان سے چڑھایا نہ جائے گا،

پاؤں کا آگے بڑھانا مجھ کو دو بھر ہو گیا — دیکھ کر سر پر سبو واعظ میری سر ہو گیا

سرِ تربت بھی گھوڑے پر ہوا کے وہ سوار آئے — قیامت ہم عناں آئی نہ دشمن ہمرکاب آیا

گالیاں دیں نامہ بر کو تلخ تلخ — حرف بوسہ زہر تھا پیغام میں

مرا پانی بھریں یہ بجلیاں کالی گھٹا والی — جو دیں کانوں کی اپنے زلفون والی بجلیاں مجھکو

مسی مل کے منہ آرہی ہیں وہ اس پر — زبان سے نہ کچھ آج سوسن کے نکلے

کہا سوسن کو جو کچھ منہ مین آیا — بڑی منہ پھٹ یہ مسی کی دھڑی ہے

میں اپنے خون کا بیڑا اٹھاؤں خود کیونکر — وہ پان دیتے ہیں شوخی سے مسکرا کے مجھے

کیوں کوستے ہو آگ لگے رنگِ حنا کو — میں چوموں جواب ہاتھ پڑیں ہونٹوں مین چھالے

الفاظ کا ابتذال ان کا کلام الفاظ کے ابتذال سے بھی خالی نہیں ہے، لیکن زبان پر ان کو غیر معمولی قدرت حاصل ہے، اس لئے وہ اس کے استعمال سے ایک لطف پیدا کر دیتے ہیں،

چند مثالیں ملاحظہ ہوں،

واعظ شراب خانہ میں کھولے گا کیا زباں — ہم خوب جانتے ہیں وہ ٹرا ہی تھان کا

شریکِ شکارِ لب جو تھا ناصح — مجھے قاز اُسے روغنِ قاز دینا

نہ جھوٹ بول کہ ہم شام سے کل آنے لگے — نہ کھا قسم ارے جھوٹے کبھی جو تو آئے

جُل دیا کرتے ہیں دن رات حسینوں کو ریاض — بڑی نٹ کھٹ بڑی چنچل ہے طبیعت میری

ایک صاحبِ علم کی وفات

از

مولوی سید آل علی صاحب نقوی بدایونی

آج کل ہندوستان میں جب علوم مشرقی کے واقف کار روز بروز کم ہو رہے ہیں، کسی پرانے صاحبِ علم کے سانحۂ ارتحال پر دلی صدمہ ہوتا ہے کہ اون کی جگہ جو آئیں گے وہ اپنے قدیم علوم کے اتنے واقف بھی نہ ہون گے،

بدایون ہمیشہ سے فضل و کمال کا گھر رہا ہے، یہیں ایک پُرانا خاندان مولینا علاؤالدین اصولی کا تھا، مولینا ممدوح الشان علم ظاہر و باطن دونوں میں ممتاز تھے، اور یہ فخر کچھ کم نہیں کہ حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا انکے شاگردون مین تھے، فقہ حنفی مین قدوری مولینا سے پڑھی تھی، کہتے ہیں کہ بچپن میں وہ شیخ جلال تبریزی کے فیض سے مشرف ہوئے تھے، زہد و ورع اور فقر و فاقہ کی زندگی بسر کی، مگر کسی سے نذر وہدیہ ضرورت سے زیادہ کبھی قبول نہیں فرمایا، اصولی کے لقب سے شہرت کے یہ معنی ہیں کہ وہ اصولِ فقہ میں کمال رکھتے تھے، زمانۂ وفات معلوم نہیں، لیکن بہر حال وہ ساتوین صدی ہجری میں تھے،

مولینا اصولی کی مبارک یادگار اس زمانہ میں مولوی سید عنایت احمد صاحب نقوی بدایونی تھے، افسوس ہے کہ موصوف نے ابھی پچھلے مہینہ ۲۳ رمضان ۱۳۵۸ھ کو بدایون میں وفات پائی، ان کا بڑا علمی کارنامہ علامہ کمال الدین فارسی شاگردِ علامہ محمود بن مسعود شیرازی

کی تنقیح المناظر کے نسخوں کی تصحیح و مقابلہ ہے، تنقیح المناظر مشہور عالم بصریات (علم المرایا والمناظر) ابن ہیثم المتوفی ۴۳۰ھ کے رسائل علم المناظر کی تلخیص و تشریح ہے، نواب عماد الملک مرحوم جو اسلامی علوم و فنون کے اس زمانہ میں سب سے بڑے قدر دان تھے، ان کو اس کتاب کی اشاعت کی جو مسلمانوں کی علم نور اور علم بصر کی عظیم الشان تحقیقات پر مشتمل ہے، بڑی فکر تھی، اس کتاب کے دو نسخے ہندوستان میں موجود تھے، ایک رامپور کے اور دوسرا پٹنہ کے کتبخانہ میں، اور تیسرا نسخہ لیڈن کے کتبخانہ میں ملا، چونکہ یہ کتاب ریاضیات کے اہم مسائل پر مبنی تھی، اسلئے اس کی تصحیح کوئی آسان کام نہ تھا، چنانچہ نواب عماد الملک مرحوم نے اس کیلئے مولوی عنایت احمد صاحب نقوی کا انتخاب کیا، موصوف نے رامپور اور پٹنہ کے نسخوں کا مقابلہ کیا، اور حتی الامکان تصحیح فرمائی، اور یہ کام مئی ۱۹۲۱ء میں انجام دیا، اسکے بعد یہ نسخہ لیڈن کے نسخہ کے مقابلہ کے لئے مستشرق کرنکو کے پاس لندن بھیجا گیا، اور اس کے بعد دائرۃ المعارف حیدرآباد نے اسکو دو جلدوں میں ۱۳۴۷ھ میں چھاپکر شائع کیا،

مرحوم کا یہ کام چونکہ اسلامی علوم و فنون کی ترقی و بقا کی راہ میں ہمارے شکریہ کا مستحق ہے، اس لئے ان کی زندگی کے مختصر سوانح کو جو ان کے صاحبزادہ خان بہادر سید آل علی نے لکھا ہے ہم ذوالقرنین سے لیکر شائع کرتے ہیں،

"س"

مولوی سید عنایت احمد صاحب نقوی مرحوم و مغفور بدایون کے معزز و قدیم خاندان سادات قبائلی سے تعلق رکھتے تھے، اس خاندان کے مورث اعلیٰ مولینا سید علاؤ الدین اصولی رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ نظام الدین اولیا سلطان جی صاحب بدایونی ثم الدہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے استاد تھے، اور یہ خاندان علم و فضل اور خوشنویسی کے لئے بھی مشہور رہا ہے،

سید صاحب مرحوم ۱۲۶۹ھ میں پیدا ہوئے، ابتدا میں اپنے گھر پر رہ کر مولینا مجید الدین صاحب مرحوم سنبھلی سے فارسی و عربی کی درس نظامی کے مطابق تکمیل کی، خاندانی ماحول کی علمی فضا، قابل و شفیق استاد کی تربیت اور ذاتی شوق علم کا یہ نتیجہ تھا، کہ سید صاحب کو مدۃ العمر مطالعہ کتب اور اضافہ معلومات کا شغف رہا، اور باخبر اصحاب کو بخوبی معلوم ہے، کہ سید صاحب کا علم آخر عمر تک مستحضر رہا، اور وہ اپنی وسعت نظر، روشن خیالی اور ذہانت کی وجہ سے نہ صرف مذہبی و علمی امور میں بلکہ زمانہ حاضرہ کے واقعات و مسائل پر بھی صحیح و صائب رائے رکھتے تھے، عربی علوم کی تکمیل کے بعد سید صاحب نے امتحان وکالت پاس کیا، بعد کو شاعری سے بھی ذوق پیدا ہوا، اور نواب مرزا خان داغ دہلوی سے اصلاح لیتے رہے، اور ان کے ارشد تلامذہ مین انکا شمار ہوتا ہے،

سید صاحب مرحوم نے ابتداءً شاہجہاں پور و بدایون میں وکالت کی، بعد ازاں اپنے خاندانی تعلقات و حقوق کی بنا پر ریاست گوالیار میں تقریباً تیس سال تک منصف و مجسٹریٹ و سپرنٹنڈنٹ پولیس پرسنل اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل پولیس کے معزز عہدوں پر تعینات رہے، پرسنل اسسٹنٹی کے زمانہ میں انھوں نے ریاست گوالیار کا پولیس مینوئل مرتب کیا، ۱۹۱۳ء میں ریاست گوالیار کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر وطن میں واپس آئے، اور چند سال بدایون و سہسوان میں وکالت کرتے رہے، یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے، کہ باوجود مشاغل ملازمت اور وکالت ممدوح کا علمی شوق اور مطالعہ کتب برابر جاری رہا، ۱۹۲۰ء میں وکالت ترک کر دی، بعدہٗ نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی مرحوم نے ان کو ایک نہایت گرانقدر اور اہم ترین خالص علمی خدمت کیلئے منتخب کیا، علامہ ابن الہیثم کی نادر اور شہرۂ آفاق تصنیف کتاب المرایا والمناظر کے قلمی نسخہ موجودہ حیدرآباد (جس کے تمام دنیا میں صرف تین قلمی نسخے حیدرآباد و پٹنہ و رامپور میں موجود تھے) کے دیگر دو نسخوں سے مقابلہ اور تصحیح اور اپنی نگرانی میں از سر نو لکھائے جانے کا کام کئی سال تک انجام دیا، یہ کتاب

سلطنت آصفیہ حیدر آباد کے زیر اہتمام قبل ازیں چھپ کر شائع ہو گئی ہے، ۱۹۲۴ء کے بعد سے سید صاحب مرحوم گوشہ نشین تھے، اور عبادت الٰہی سے جو وقت بچتا تھا، باوجود ضعف بصارت زیادہ تر مطالعۂ کتب میں صرف کرتے تھے۔

انتقال سے چند ماہ قبل سید صاحب بدایوں آگئے تھے، چار ماہ بعارضۂ فالج علیل رہنے کے بعد تقریباً اسی سال کی عمر میں بروز دوشنبہ ۲۳ر رمضان المبارک ۱۳۵۸ھ کو واصل بحق ہوئے، اور اپنے خاندانی باغ میں اندر احاطۂ درگاہ جناب مذاق میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ دفن ہوئے،

انتقال کے وقت سید صاحب مرحوم نے تین فرزند، پانچ صاحبزادیاں، پانچ پوتے پوتیاں، ۲۰ نواسے نواسیاں اور دو پرنواسے چھوڑے، تینوں صاحبزادے بفضلہ معزز عہدوں پر ممتاز ہیں، (۱) خان بہادر سید آل علی نقوی ایم اے، پی ای ایس رجسٹرار ڈیپارٹمنٹل امتحانات صوبۂ متحدہ (۲) ڈاکٹر سید آل محمد نقوی ایم بی بی ایس پرسنل فزیشن نواب صاحب ٹونک (۳) سید سبط نبی نقوی ایم ایس سی اسسٹنٹ میٹرولاجیکل ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ ہند پونا،

تلخیص و تبصرہ

ڈاکٹر فرانز بلیوا کا لکچر

ویانا کے مشہور ماہر نفسیات ڈاکٹر فرانز بلیوا نے آکسفورڈ کی ایک مجلس نفسیات میں نفسیات کے مختلف مسائل پر کئی لکچر دیئے ہیں، ان کی تلخیص ذیل میں درج ہے،

احساس کمتری کسی شخص میں کمتری کا احساس اسوقت پیدا ہوتا ہے، جب وہ اپنی اندرونی دنیا میں اپنے آپ کو اور اپنے ذاتی کردار کو اپنے اخلاقی معیار کے مطابق نہیں پاتا، احساس کمتری گویا اپنی ذات کی اخلاقی ملامت ہے، جب اس جذبہ سے کوئی مغلوب ہوتا ہے، تو وہ بعض معاشرتی فرائض کو انجام دینے سے قاصر رہتا ہے، کمتری کے جذبہ اور کمتری کی گرہ میں فرق ہے، اول الذکر ایک انسانی صفت ہے، لیکن جب معاشرتی فرض کو پورا کرنے میں کوتاہی اور اخلاقی معیار کو نظر انداز کرنے کی کوشش کیجاتی ہے، تو احساس کمتری کی گرہ پڑجاتی ہے،

برتری کی گرہ کمتری کی گرہ کی مخالف نہیں بلکہ دونوں توام ہیں، کوئی نفسیاتی معالج کسی شخص کی کمتری کی گرہ کا استیصال نہیں کرسکتا، البتہ وہ اس کی تدابیر بتا سکتا ہے، اس مرض کا علاج خود مریض کے ہاتھ میں ہے،

بچوں کی تربیت عام طور سے جسمانی سزا بچوں کی برائیاں دور کرنے کے لئے دی جاتی ہے مگر در اصل سزا دیتے وقت سزا دینے والے محض اپنی فوقیت اور برتری سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں، اس سے ایک بچہ تھوڑی دیر کے لئے فرمانبردار اور اطاعت گذار تو ضرور ہوجاتا ہے، مگر آگے چل کر اسکی

طبیعت پر خوشگوار اثرات مترتب نہیں ہوتے ہیں، ہر بچہ شخصیت رکھتا ہے، اور اس کے دل میں اس کا احترام ہوتا ہے، سزا سے اسکی احترام ذات کو صدمہ پہونچتا ہے، جو لوگ بچون کی جسمانی سزا کے قائل ہیں، ان کو درحقیقت بچوں کی شخصیت کے احترام کا احساس نہیں جسے ہر حال میں ہونا چاہئے، جس طرح پودون کے اُگنے اور بڑھنے مین آفتاب کی شعاعیں لازمی ہیں، اسی طرح بچون کے صحیح نشوونما کے لئے محبت وشفقت ضروری ہے، جبر اور تحکم سے بچون میں ذمہ داری کا احساس پیدا نہیں ہوتا، اگر بچون اور ان کے بزرگون اور استادوں میں موانست ہے تو انکی تربیت اور تعلیم میں کوئی دقت حائل نہیں ہوتی اسی لئے ایک ماہر نفسیات کی نظر میں بچہ کی تعلیم میں سب سے اہم عنصر اساتذہ کی موانست ہے،

یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ بچوں پر بہت جلد ذمہ داری عائد نہ کیجائے، کیونکہ وہ مشکل سے اس کا بار سنبھالتے ہیں، خصوصاً معاشرتی ذمہ داری کا بار ان پر ڈالنا بالکل غلط ہے، ان کی تربیت ایسی ہونی چاہئے، کہ وہ معاشرت کی ذمہ داری کو خود بخود محسوس کریں، ایسی تربیت مشکل ضرور ہے مگر تعلیم اور تربیت کا یہ بہت ہی اہم پہلو ہے،

عصبی المزاجی

بعض امراض ایسے ہیں، جو نفسیاتی مشکلون اور دقتوں کے سبب سے پیدا ہوتے ہیں، مثلاً ایک لڑکا اپنے اسکول کا کام کسی دن انجام نہیں دیتا، وہ اسکول جانے سے ڈرتا ہے، مگر اسکول نہ جانا بھی پسند نہیں کرتا ہے، اس کشمکش میں اس میں عصبی المزاجی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، وہ سر کے درد میں مبتلا ہو جاتا ہے، جس سے اسکو اسکول نہ جانے کی ایک معقول وجہ ہاتھ آجاتی ہے، عصبی المزاجی سے مختلف قسم کے جسمانی امراض پیدا ہو سکتے ہیں، جن کا علاج ایک محلل نفسی ہی کر سکتا ہے، اسی لئے امراض کے علاج میں یہ جاننے کی بڑی ضرورت ہے کہ وہ جسمانی فتور یا نفسیاتی انتشار کے باعث سے تو نہیں ہین،

عصبی المزاج لڑکا کہنا درست نہیں، کیونکہ ایک لڑکے کو عصبی المزاج اسی وقت کہہ سکتے ہین جب اس کی مشکلات کا اصلی سبب ہم سمجھنے سے قاصر رہ ہین، عصبی المزاجی کوئی فطری چیز نہین،

اور نہ یہ باپ سے بچے کو وراثت میں ملتی ہے، بلکہ بچہ جب مشکلات میں پڑ جاتا ہے، تو وہ عصبی المزاج ہو جاتا ہے، وہ اپنے دل میں مختلف قسم کے حوصلے اور ارمان رکھتا ہے، جب ان کی تکمیل وہ مشکل سمجھتا ہے تو اپنے کو کمزور اور بودا پاتا ہے، اور جب اسکو اپنی کمزوری اور بودے پن کا احساس ہو جاتا ہے، تو وہ اپنے کو غیر محفوظ اور غیر مامون تصور کرتا ہے، جس کا لازمی نتیجہ عصبی المزاجی ہے، والدین عموماً حوصلہ مند اور پُرارمان لڑکے کو بہت پسند کرتے ہیں، اور کاہل لڑکے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے، مگر کاہلی حوصلہ کی محض ہزیمت خوردہ صورت ہی، لڑکا کاہل اسلئے ہو جاتا ہے، کہ وہ اپنے حوصلہ کی تکمیل مین ناکام رہتا ہے، ایک بچہ کا اعلیٰ حوصلہ اور بلند ارادہ کوئی بری چیز نہیں، مگر والدین کو یہ احتیاط رکھنی چاہئے کہ وہ اپنے حوصلون اور ارادوں کی تکمیل میں اس طرح منہمک نہ ہونے پائے کہ ان کی ناکامی کے بعد اس کو پھر کسی اور شے سے دلچسپی اور لگاؤ پیدا نہ ہو سکے، اسی لئے والدین کا فرض ہے کہ اپنے بچون کو زندگی کی مختلف قسم کی دلچسپیوں میں مشغول رکھیں، تاکہ ایک کی ناکامی کی تلخی دوسرے کی کامیابی کی خوشی سے زائل ہوتی رہے،

زندگی مین ناکامیابی

کسی شخص کی زندگی کی ناکامیابی کے عموماً دو سبب ہوتے ہیں، یا تو وہ اپنی زندگی کا مقصد بالکل غلط یا بہت بلند قرار دیتا ہے، اور اگر کوئی شخص اسکو اسکے مقصد کو ناممکن الحصول بتاتا ہے، تو وہ اسکی طرف مطلق دھیان نہیں دیتا ہے، اس سے دو نتیجے پیدا ہوتے ہیں، یا تو وہ اپنی ساری قوت اور سرگرمی فضول ضائع کرتا ہے، یا پھر وہ پوری قوت اور سرگرمی سے کام کو انجام دینے میں کوتاہی شروع کر دیتا ہے، اور جان چرانے کے لئے طرح طرح کے بہانے اور حیلے تراشنے کا عادی ہو جاتا ہے،

عورت اور مرد کی غیر مساویانہ حیثیت

یہ کہنا کہ عورتین مردون سے کمتر ہیں، محض مردون کا اختراع ہے، اور وہ اپنی خود غرضی سے ایسا کہتے ہین، عورت اور مرد دونوں ازدواجی زندگی کے برابر حصہ دار

اور ذمہ دار ہین، اس لئے زندگی کی گتھیون اور پیچیدگیون کو سلجھانے کے لئے دونون کی مساویانہ جراءت اور ہمت کی ضرورت ہے، ان میں سے کسی کا یہ خیال کرنا کہ بعض مشکلات کو حل کرنا اس کا فرض نہین، دونون کی زندگی کے لئے مہلک ہے، کیونکہ زن وشو کی زندگی ایک فریضہ ہے، کوئی صلحنامہ یا معاہدہ نہیں کہ "تم یہ کام کرو اور میں وہ کام انجام دون"، اگر اسکو صلحنامہ یا معاہدہ قرار دیا جائے، تو بہت ممکن ہے کہ کچھ دنوں کے بعد فریقین مین سے کوئی فریق اسکی پابندی میں ہر قسم کا نقصان اٹھانے کے بعد صلحنامہ سے دست بردار ہونے کی کوشش کرے، یا اگر ازدواجی زندگی کا تخیل یہ ہو کہ ایک طاقتور فرد ایک کمزور فرد کو اپنے سایۂ عاطفت میں لیتا ہے، تو اسکی بنیاد بہت مستحکم نہیں ہو سکتی ہے، کیونکہ ایسی حالت میں بہت ممکن ہے، کہ طاقتور فرد کمزور فرد کی لاچاری اور بے بسی سے بے جا فائدہ اٹھا کر اسکی زندگی کو بے مزہ کر دے یا اس کو اپنے لئے بار سمجھکر اپنی زندگی کو تلخ بنالے،

ازدواجی زندگی کا انحصار سر اسر محبت پر نہیں ہو سکتا، محبت، شادی کی محض جذباتی تمہید ہے یہ ازدواجی زندگی کے لئے ایک اچھی بنیاد ہو سکتی ہے، مگر اس سے ازدواجی زندگی کی پوری عمارت تعمیر نہیں ہو سکتی، زوجین میں سے اگر کوئی یہ سمجھتا ہے، کہ دوسرا فریق ہر چیز اسکی خواہش کے مطابق انجام دیتا رہے گا، سر اسر غلطی ہے، ازدواجی زندگی اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے، جب فریقین میں سے ہر ایک اپنے سے دلچسپی لینے کے بجائے دوسرے کی طرف اپنی ساری توجہ برابر قائم رکھے،

ازدواجی زندگی میں اقتصادی اور دوسری مشکلات برابر پیش آتی رہتی ہیں، ان کا دور کرنا مشکل نہیں، بشرطیکہ فریقین میں یکجہتی اور یگانگت ہو، بعض عصبی المزاج زوجین مشکلات کو حل کرنے کے لئے اپنے کو بالکل بے بس پاتے ہیں، مگر یہ عموماً وہی ہوتے ہیں، جو متاہل زندگی کو ایک فریضہ تصور کرنے کے بجائے اپنے کسی خاص مقصد کی تکمیل کا ذریعہ سمجھتے ہین،

ازدواجی زندگی میں ایسا زمانہ آتا ہے، جب کہ وہ بالکل مکدر اور تلخ معلوم ہوتی ہے، لیکن دراصل یہ تکدر اور تلخی نہ شریک حیات کے خلاف پیدا ہوتی ہے، اور نہ متاہل زندگی کے، یہ سراسر دنیاوی زندگی سے بیزاری کا نتیجہ ہوتا ہے، اگر زندگی کا ایک خوشگوار تخیل، اور دلپذیر نصب العین رکھا جائے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ متاہل زندگی اجیرن ہو،

خواب کا تواتر تکلیف دہ اور ناخوشگوار واقعات کی یاد سے خواب میں تواتر پیدا ہوتا رہتا ہے، کبھی گذشتہ حادثہ کا خوف، یا آئندہ ناکامیابی کا خطرہ ایسا دل میں بیٹھ جاتا ہے کہ خواب میں یہ خوف اور خطرات باہم نظر آتے رہتے ہیں، اقتصادی پریشانی، مالی تباہی، اور بے روزگاری کی داستانی خواب میں مختلف صورتون میں نمودار ہوتی ہے، جو اعلیٰ جذبات کی پرورش اور ذہن کے نشو ونما کے لئے مہلک ہے بعض اوقات خواب کے تواتر کا نتیجہ ذہنی انتشار، دنیا سے بیزاری بلکہ خودکشی ہوتا ہے، اور یہ محض اسلئے کہ بچپن میں لڑکوں کو عام طور سے نئے واقعات اور حوادث کے مطابق اپنے کو بنا لینے کی تربیت نہیں دی جاتی ہے، جن لڑکوں کو نئے حالات و واقعات کے مطابق اپنے کو ڈھالنے کا تجربہ ہے، وہ اپنی مشکلون اور دقتون کو اپنی کامیابی اور بھلائی کا زینہ سمجھتے ہیں،

"ص ع"

کام

کام کی زیادتی کا آخر کیا سبب ہوتا ہے؟ یا تو کام کرنے والے میں کوئی نقص ہوتا ہے، جسکی بنا پر وہ سارے کام کو وقت پر انجام دینے سے قاصر رہتا ہے، یا وہ اپنے حریف اور مدمقابل سے سبقت لیجانے کی کوشش میں برابر مشغول رہتا ہے یا اس کو اپنی کمتری کا احساس ہوتا ہے، اور وہ اپنے کو برتر ثابت کرنے کی خاطر کسی نہ کسی کام میں منہمک ہوتا ہے، یا اپنے تکدر، رنج اور ملال کو دور کرنے کے خیال سے وہ مختلف قسم کے کاموں میں دلچسپی لیتا رہتا ہے، اگر کام کی کثرت کے باعث اسکی صحت خراب ہو جاتی ہے،

تو اس کا بڑا سبب کام کی زیادتی نہیں، بلکہ حصولِ مقصد کی ناکامی کا خوف ہے،

کام مضر ہونے کے بجائے ہمیشہ مفید ہے، ایک مشغول آدمی ایک کاہل شخص سے کہیں زیادہ مسرور رہتا ہے، کام میں خواہ کیسی ہی مشکل اور پیچیدگی ہو اس کے انجام دینے میں جو حظ اور لطف ملتا ہے، وہ بیکاری میں نہیں ملتا، خواہ اس میں کتنا ہی عیش و تنعم کیوں نہ میسر ہو، کام کا نتیجہ حسب خواہ نہ سہی، لیکن اس کی مشغولیت سے جو لذت حاصل ہوتی ہے، وہ بے کاری کی مفرت سے بہرحال بہتر ہے،

کام سے اگر زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا مقصود ہو تو سب سے پہلے اس غلط خیال کو دور کرنا چاہئے، کہ کام مقصد حاصل کرنے کا ایک ناخوشگوار ذریعہ ہے، کام سے لطف لینا ہی کام سے فائدہ حاصل کرنا ہے، بچے کھیل میں غیر معمولی جوش اور انہماک کا اظہار کرتے ہیں، یہ جوش اور انہماک کھیل سے نہیں، بلکہ اس جذبہ اور دلچسپی سے پیدا ہوتا ہے، جو ایک بچہ کھیل سے رکھتا ہے، وہ اپنی ہر مشغولیت میں اسی قسم کے جوش اور انہماک کا ثبوت دے سکتا ہے، مگر وہ اپنے بزرگوں کی زجر و توبیخ، اور جبر اور دباؤ سے بعض خوشگوار چیزوں کو بھی ناخوشگوار سمجھنے کا عادی ہو جاتا ہے، اگر ایک شخص اپنے کام میں وہی جذبہ رکھتا ہو، جو بچے اپنے کھیل میں رکھتے ہیں، تو پھر اس کی زندگی کا ہر کام محض کھیل ہو جائے، بعض لوگ کام کو اپنے اعمال کی سزا تصور کرتے ہیں، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، بلکہ اسکو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کا فضل سمجھنا چاہئے، جس کے ذریعہ بہت سی برائیوں سے چھٹکارا اور غم و مصیبت سے نجات ملتی ہے، جو شخص زندگی کے آخری لمحہ تک کام کرتا ہے، وہ اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک خوش رہتا ہے، کاہلی زندگی کو افسردہ اور مغموم بنا دیتی ہے، اس سے بوڑھاپے کے آثار بھی جلد پیدا ہو جاتے ہیں،

کوئی شخص پیدائشی کاہل نہیں ہوتا، بچے فطرۃً بہت چست اور جوشیلے ہوتے ہیں وہ

جو کچھ دیکھتے اور سنتے ہیں، اس سے ان کو دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے، دنیا ان کے لئے ایک عجائب خانہ ہوتی ہے، وہ کام کے ہر راز کو جاننا چاہتے ہیں، اسی لئے ان کی تلاش و تجسس کی کوئی حد نہیں ہوتی، جب ان کی فطری تلاش و تجسس میں کوئی مزاحمت یا مداخلت ہوتی ہے، تو ان کی سرگرمی اور دلچسپی میں فرق آجاتا ہے، اور ان کے بڑھتے ہوئے حوصلوں میں کمی ہو جاتی ہے،

بچوں کی ضرورت سے زیادہ نگہبانی اور محافظت بھی ان میں کاہلی پیدا کرتی ہے، بعض محتاط والدین اپنے بچوں سے کسی قسم کی غلطی کا ارتکاب پسند نہیں کرتے ہیں، اسلئے ان کو وہ کوئی ایسا موقع نہیں دیتے ہیں جس سے کسی غلطی کے ارتکاب کا احتمال بھی ہو، مگر یہ صحیح تربیت نہیں، بچے آزادی سے اپنی اندرونی قوت کا اظہار چاہتے ہیں، جب ان کو یہ آزادی نہیں ملتی ہے، تو وہ صحیح نشو و نما سے محروم ہو کر کاہل ہو جاتے ہیں، پھر آگے چل کر ان کو آزادی بھی ملتی ہے، تو ان میں اتنی خود اعتمادی نہیں ہوتی، کہ وہ کوئی کام انجام دے سکیں، ان کی شخصیت فنا ہو کر برباد ہو چکی ہے،

بعض بچے اپنے شفیق والدین کے لاڈ پیار کو اپنی کاہلی کا ذریعہ بناتے ہیں، شفیق والدین اپنی محبت کی بنا پر اپنے بچوں کو کوئی ایسا کام نہیں کرنے دیتے، جس میں وہ غیر معمولی طور سے منہمک ہو کر پریشان ہوں، بچے اس شفقت سے فائدہ اٹھا کر اپنی ساری سرگرمی اور اولوالعزمی کھو بیٹھتے ہیں، اور اپنا ہر کام والدین ہی کے ہاتھوں سے انجام پانے کے عادی ہو جاتے ہیں، اور جب وہ اپنی کاہلی اور سستی ہی کے ذریعہ والدین کی محبت سے مستفیض ہوتے رہتے ہیں، تو پھر ان کو چست اور سرگرم بننے کی کیا ضرورت ہے،

بعض کام ایسے ہیں، جن کو انجام دینے میں بچوں کو تکدر اور الجھن پیدا ہوتی ہے، مگر ایسے کام وہی ہوتے ہیں جنکا کرنا خود ان کے والدین کو جبرا اور گراں گذرتا ہے، کام خواہ کیسا ہی ادنیٰ

مشکل ہو اگر والدین خود اسکو بطیب خاطر کرین تو پھر کوئی سبب نہین کہ ان کے بچے بھی اسکی طرف رضا ورغبت کیساتھ متوجہ نہ ہوں، بچوں کی سستی اور کاہلی میں ان کے والدین کے عادات و اطوار کا مظاہرہ ہوتا ہے،

کام مشکل بھی ہوتا ہی، مگر اسی وقت جب کام کرنے والا بعض خاص اسباب کی بنا پر اس کو ظاہر کرنا نہیں چاہتا، کہ وہ کام اس کو پسند نہیں، اور جب کام پسند نہیں تو اسکو انجام دینے میں ہر قسم کی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں، ان پیچیدگیوں سے گھبراہٹ اور تکدر ہی کا نام جسمانی اضمحلال ہے، جس کا ردعمل سستی اور کاہلی ہی، مگر کام کرنے والے کو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہی، کہ وہ کام کی زیادتی سے تھک گیا ہے، اور اسکو آرام کرنے کی ضرورت ہی،

کام کا خوشگوار اور ناخوشگوار یا مشکل اور آسان ہونا کام کرنے والے کے جذبہ پر منحصر ہے اگر اس کے جذبہ میں امنگ جوش اور اولوالعزمی ہی، تو ہر ناخوشگوار کام خوشگوار ہے، اور اگر بددلی بے رُخی اور بے اعتنائی ہی، تو ہر آسان کام مشکل ہی، جس کا لازمی نتیجہ سستی اور کاہلی ہی،

کاہلی اور سستی کا علاج اس کو دور کرنے کی پیہم کوشش میں نہیں ہے، اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ وہ کاہل ہی اور اپنی کاہلی کو دور کرنے کی کوشش کر رہا ہی تو یہ بالکل مضحکہ خیز ہے، کاہلی کا واحد علاج کام میں غیر معمولی دلچسپی پیدا کرنا ہے، خواہ وہ کام کیسا ہی ہو، کسی کام کو اپنے سے فروتر سمجھنا بھی کاہلی کی دلیل ہے، ہر کام اپنے رتبہ اور معیار کے مطابق ہو سکتا ہے، بشرطیکہ وہ رضا اور رغبت سے انجام دیا جائے،

"ص ع"

اخبار علمیہ

امریکہ کا تعلیم یافتہ طبقہ

ممالک متحدہ امریکہ کے ایک ماہر تعلیم نے ایک ہزار گریجویٹ اور انڈر گریجویٹ کو سوالات کی ایک لمبی فہرست بھیجی تھی، ان کے جو جوابات موصول ہوئے ان سے اندازہ ہوتا ہی کہ ان میں اکثر ۱۸۰۰ سے ۲۵۰۰ ڈالر تک کی سالانہ آمدنی رکھتے ہیں، ان میں زیادہ تر اپنے پیشے کو پسند کرتے ہیں، اور اپنے آقا اور افسر سے خوش ہیں، گو ۱/۲ سے زیادہ اپنی آیندہ ترقی سے مطمئن نہیں ہیں، ان میں سے اکثر تجارتی خط و کتابت اپنے پیشہ کی روداد اور بجٹ تیار کرنے میں مہارت نہیں رکھتے اور صرف ۱/۲ تقریر کر سکتے ہیں، ان میں سے ۱/۴ اپنے مقررہ بجٹ کے اندر زندگی بسر کرتے ہیں، ۱/۳ بڑھاپے کے لئے مالی حیثیت سے کچھ مطمئن ہیں، زن و شو میں اختلاف عموماً گھریلو اخراجات کے سلسلہ میں پیدا ہوتا ہے، شادی کے بعد زن و شو میں مکان کی آرائش کی قدرتی خواہش ہوتی ہے، چنانچہ وہ مکان کو آرام دہ اور خوبصورت بنانے کی کوشش کرتے ہیں، بچوں کو ۶۵ فی صدی معقولیت سمجھا بجھا کر، اور ۵۰ فی صدی زد و کوب کے ذریعہ قابو میں رکھنے کی کوشش کیجاتی ہی، ۸۰ فی صدی گھروں میں ماں اور باپ دونوں بچوں کی تربیت کے ذمہ دار ہوتے ہیں، فرصت کے اوقات کے مشاغل زیادہ تر اخبار بینی اہل خاندان سے مختلف مسائل پر گفتگو دوستوں سے ہنسی مذاق اور ریڈیو سے دلچسپی ہوتے ہیں، ریڈیو کے پروگرام میں زیادہ دلچسپی خبروں اور فٹ بال کے کھیلوں سے لیجاتی ہے میگزین اور رسالے بھی پڑھے جاتے ہیں، جن میں Readers Digest. Time اور Life) بہت مقبول

ہیں، عام طور سے کھیل، سفر اور علمی تحریروں کا کافی ذوق ہے، مگر ان چیزوں کے لئے ان کے پاس وقت نہیں،

مردوں کی خواہشات زیادہ تر یہ ہیں، کہ وہ ایک مسرور ازدواجی زندگی بسر کریں، مالی حیثیت سے مطمئن ہوں، اور بڑھاپے میں مالی سکون حاصل ہو، ان کا طرز رہایش آرام دہ ہو اور ان کے گھر کے لوگ خوش و خرم ہوں، عورتیں بھی عام طور سے مسرور ازدواجی زندگی، آرام دہ طرز رہایش اور خوشحال گھر کی متمنی ہوتی ہیں، مگر اس کے ساتھ ہی وہ ایسی اولاد کی خواہاں رہتی ہیں جن پر وہ فخر کر سکیں، وہ سفر اور اپنی زندگی میں کوئی غیر معمولی اور اہم واقعہ بہت پسند کرتی ہیں،

۸۲ فی صدی ووٹ دینے کے مستحق ہیں، سیاسی اور معاشرتی مسائل پر ۵۰ فی صدی اپنے مہمانوں سے .... ۶۹ فی صدی اپنے خاندان کے افراد اور ۴۳ فی صدی اپنے ساتھ کام کرنے والوں سے بحث و مناظرہ کرتے ہیں، صرف ۱/۴ سیاسی کاموں میں حصہ لیتے ہیں، ووٹ دینے کے علاوہ اور دوسرے شہری فرائض انجام دینا نہیں چاہتے، اور میونسپلٹی اور دوسرے مقامی معاملات کی طرف بھی بہت زیادہ متوجہ نہیں ہوتے،

مذکورۂ بالا ماہر تعلیم کا خیال ہے کہ اس صورت حال کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے، کہ امریکہ کی یونیورسٹیوں کی تعلیم بالکل ناقص اور ناکام نہیں، گو یہ عجیب بات ہے، کہ گریجوایٹ اور انڈر گریجوایٹ کے درمیان صرف تھوڑی سی مالی رعایت اور برتری کے علاوہ ذہنی اور ثقافتی حیثیت سے کوئی فرق نہیں، یہی کیفیت ان لوگوں کی بھی ہے، جو کالج کی تعلیم کے زمانہ میں اچھے اور خراب طلبہ کہلاتے ہیں، روزمرہ اور کاروباری زندگی میں دونوں یکساں سطح پر آجاتے ہیں، دونوں ایک ہی قسم کے ریڈیو کے پروگرام کے سننے کے عادی ہو جاتے ہیں، دونوں سینما میں ایک ہی قسم کا تماشا دیکھنا پسند کرتے ہیں، دونوں ایک ہی قسم کے رسائل پڑھتے ہیں، اپنے اپنے پیشے کے متعلق دونوں کا ایک ہی نقطۂ نظر قائم ہو جاتا ہے، دونوں

اپنی گھریلو زندگی میں ایک ہی قسم کے تفکرات میں مبتلا رہتے ہیں، اور دونوں معاشرتی اور شہری معاملات میں حصہ لینا بالکل غیر دلچسپ اور غیر اہم سمجھتے ہیں،

ایڈورڈ ویسٹر مارک کا انتقال

ایڈورڈ ویسٹر مارک نے جو ایک عرصہ تک لندن یونیورسٹی میں عمرانیات کا پروفیسر تھا، گذشتہ اکتوبر میں انتقال کیا، وہ ایک عمیق النظر فلسفی اور بین الاقوامی شہرت کا مالک تھا، اوائل زندگی میں اسکو خیال پیدا ہوا، کہ اخلاقی خیالات اور مذہبی اعتقادات میں گہرا تعلق ہے، چنانچہ اس نقطۂ نظر سے اس نے یورپ کے علاوہ دوسری قوموں کی روایات اور اعتقادات کا مطالعہ کرنا چاہا، اور اس کے لئے مراکش کو منتخب کیا، اور وہاں جا کر چار سال تک مقیم رہا، یہاں اس نے نہ صرف انسانیاتی معلومات جمع کئے، بلکہ وہاں کے لوگوں کے طرز زندگی و غور و فکر سے بھی واقفیت حاصل کر کے ان کے رسم و رواج کو آسانی سے سمجھا جو تمدن کے مختلف دور میں پیدا ہوتے رہے، یہاں کی تحقیقات اس نے اپنی مشہور کتاب "اخلاقی تخیلات کی ابتدا اور نشو و نما" (The origin and Development of moral ideas) میں قلمبند کی جو دو جلدوں میں ۱۹۰۶ء اور ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی تھی، یہ کتاب بہت اہم اور بلند پایہ سمجھی جاتی ہے اور اخلاقیات پر ایک فلسفیانہ مقالہ یا اخلاقی خیالات کی تاریخ کہی جا سکتی ہے، اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں تحلیلی اور تاریخی تجربوں میں امتزاج پیدا کر کے یہ دکھایا گیا ہے، کہ اخلاقی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کی ابتدا، معاشرتی تکدر اور تشکر سے ہوتی ہے، ڈاکٹر ویسٹر مارک کی اور دوسری تصنیفات یہ ہیں (۱) مراکش میں انسانی شادی، رسم اور اعتقاد کی تاریخ (۲) اخلاقی اضافیت (۳) عیسائی مذہب اور اخلاق،

مصر کے آرٹس کالج میں مشرقی زبانوں کی تعلیم

مصر میں ایک شاہی فرمان صادر ہوا ہے، کہ مصر کے آرٹس کالج میں مشرقی زبانوں اور ان کے ادب کی تعلیم کے تین شعبے کھولے جائیں، پہلا شعبہ سامی زبانوں کی تعلیم کا ہو، اس میں اکادمی، کنعانی، آرامی، جنوبی، سامی کے ادب، زبان اور قواعد وغیرہ کی تعلیم دیجائے گی، دوسرا شعبہ اسلامی زبانوں کا ہو، جس میں فارسی، ترکی، **اردو** اور دوسری پرانی اور نئی زندہ غیر سامی زبانوں کی تعلیم ہوگی، تیسرا شعبہ مختلف ملکوں کی عربی بولیوں کی تعلیم کا ہو، اس میں مختلف ملکوں کے نئی اور پرانی عربی بولیوں کی تعلیم ہو گی،

ان شعبوں میں سے کسی ایک میں داخلہ کے لئے شرط یہ ہے، کہ عربی یا اس کے برابر کسی زبان کا سند یافتہ ہو، سامی زبانوں کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ان یورپین زبانوں کا جاننا ضروری ہوگا، جن میں طالب علم کو ادب کی سند ملتی ہے، طالب علم کو اجازت ہو گی، کہ مشرقی زبانوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان زبانوں کی بھی تعلیم حاصل کرے،

کامیاب طلبہ کو مشرقی زبانوں کے اس شعبہ کی سند دیجائے گی، جس میں انھوں نے تعلیم پائی، اور یہ سند اس علمی درجہ کے برابر ہو گی، جس سے ایک طالب علم ادب میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کر سکتا ہے،

تصحیح

اکتوبر کے معارف میں دمشق کے علمی ادارے (۳۱۱) کی سرخی کے تحت میں بعض غلطیاں رہ گئی تھیں ناظرین تصحیح کر لیں

غلط	صحیح	غلط	صحیح
دار الکتب لاھیۃ الظھیریہ	دار الکتب لاھلیۃ الظاھریہ	الجمعیۃ السوریہ	الجامعۃ السوریہ
خیر الدین الزورق	خیر الدین الزرکلی،	قاموس العالم	قاموس الاعلام

ادبیات

قندِ پارسی

صحرا

از جناب اسد ملتانی

بیا منزل کنیم اے ہمدم فرزانہ در صحرا
کہ دل بے پردہ بیند جلوہ جانانہ در صحرا

زمیں تصویر یکرنگی، فلک نقشِ ہم آہنگی
فضا باشد مئے توحید را پیمانہ در صحرا

بہر گامے روا سجدہ، صنم پنہان بہ ہر ذرہ
نہ باشد امتیاز مسجد و بت خانہ در صحرا

ہوائے صحن و بام و در بود نسوانیت پرور
شود نشو و نماے ہمت مردانہ در صحرا

نیارد تابِ ہا و ہو در و دیوارِ کاخ و کو
بکامِ دل توان زد نعرہ مستانہ در صحرا[1]

بیا دیوار بشکافیم زندانِ تمدن را
کہ چون موج ہوا رقصیم آزادانہ در صحرا

چہ داند برگ گل در باغ روداد غم الفت
زبانِ خار خوش می گوید این افسانہ در صحرا

کجا باشد خبر دلبستگانِ شمع محفل را
کہ می سوزد چراغ لالہ بے پروانہ در صحرا

بتر سم کردۂ برخود حجاب رنگ و بو طاری
اگر حشمت نمی بیند بجز ویرانہ در صحرا

نباید اے اسد مارا چرا ذوق بیابانہا
خدا را ہم پسند آمد بناے خانہ در صحرا

[1] مصرع علامہ مستغنی مرحوم ملک الشعرا افغانستان،

غزل

از جناب احسن صاحب نگرامی ایڈوکیٹ پرتاب گڈھ

نگاہِ یار کہ مستیش صد بہار دہد — ہزار بادہ بہ رندانِ بادہ خوار دہد

چہ عیشہا بہ دل این سلب اختیار دہد — رضائے یار دہد کیفِ اضطرار دہد

چہ کیف ہا نگہِ نیم باز یار دھد — نوید بادہ بہ ہر مست و ہوشیار دہد

ازیں فزون و ازین بہ چہ بایدم از عشق — دلِ فگار دہد چشم اشکبار دہد

جنوں چہ طرہ ہمی پرورد فضائے بہار — کہ دامنِ گلِ رعنا بدستِ خار دہد

خوشا بہارِ تصورِ شبِ درازِ فراق — بصد کرشمہ تماشائے زلف یار دہد

گلِ حیات بہ خارِ اجل ہم آغوش است — ہزار مرحلہ یک شامِ انتظار دہد

ہم آنچہ او بپسند دبہ آن روش دارم — مرا بہ اخترِ بختم چہ اختیار دہد

غزل

از نواب ضیا یار جنگ بہادر ضیا حیدرآباد دکن،

بادہ را صرف بے سبو چہ کنیم، — دل نداریم آرزو چہ کنیم،

دل شود مطمئن ز ذکرِ خدا، — ہمچو دیوانہ ہائے ہو چہ کنیم،

آب در چشمۂ طہارت نیست — فکر خوش کردن وضو چہ کنیم،

غنچۂ دل ہموم حسرت سوخت — باز امیدِ رنگ و بو چہ کنیم،

گوہر اندر صدف نیا سوداست — کوششِ حفظِ آبرو چہ کنیم

جامۂ عافیت ضیا، چون گل — تار تار است شست و شو چہ کنیم

مطبوعاتِ جدیدہ

اتاترک مولفہ جناب محمد مرزا صاحب دہلوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۸۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عہ پتہ کتب خانہ علم و ادب دہلی،

اردو میں اتاترک مصطفٰے کمال کی متعدد سوانحعمریاں لکھی جاچکی ہیں لیکن یہ کتاب معلومات، ماخذ کے استناد اور اسلوبِ تحریر، ہر لحاظ سے ان سب میں بہتر ہے، اس میں اتاترک کی پیدائش سے لیکر وفات تک کے حالات اور کارنامے اختصار اور جامعیت کے ساتھ لکھے گئے ہیں، اتاترک کی پوری زندگی عبارت ہے ترکی قوم کی خدمت سے، اسلئے یہ کتاب درحقیقت ترکی قوم اور ترکی حکومت کے زوال و عروج انکی تباہی اور دوبارہ زندگی کی تاریخ ہی کہ جنگ عظیم میں کس طرح اس کا خاتمہ ہوا، اور مصطفٰے کمال نے ایک شکست خوردہ اور پست و پامال قوم کو جس کا سیاسی وجود دنیا سے مٹ چکا تھا، گوناگوں مشکلات مخالف حالات اور ہر طرح کی بے سروسامانی کے باوجود محض اپنے عزم و استقلال، ہمت و شجاعت اور تدبیر و سیاست سے کس طرح زندہ کرکے دنیا کی طاقتور اور ترقی یافتہ حکومتوں کی صف میں کھڑا کر دیا، ان سیاسی حالات کے ساتھ مصطفٰے کمال کے اصلاحی اور تعمیری کارناموں کو بھی اس طرح پیش کیا گیا ہے، کہ اس سلسلہ کی بعض قابلِ اعتراض باتوں کے اسباب و مصالح بھی روشنی میں آجاتے ہیں، سیاسی واقعات کی خشکی ظاہر ہی، لیکن مصنف کے طرزِ تحریر نے ان خشک واقعات کو دلچسپ داستان بنا دیا ہے، کتاب کے شروع میں ماخذوں کی فہرست بھی دیدی

محکومیتِ نسوان

مترجمہ مولوی معین الدین صاحب انصاری بیرسٹرایٹ لا تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۳۴ صفحے، کاغذ، کتابت، طباعت بہتر قیمت مجلد عہ پتہ:- مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

محکومیتِ نسوان (The Subjection of Women) جان اسٹوارٹ مل کی مشہور تصنیف ہی، کچھ زیادہ زمانہ نہیں گذرا کہ یورپ مین بھی عورتوں کی حالت مشرق کی عورتوں سے کچھ بہتر نہ تھی، بلکہ ان کو وہ حقوق بھی حاصل نہ تھے، جو بعض مشرقی اقوام کی عورتوں کو حاصل ہیں، جان اسٹوارٹ مل نے عورتوں کی آزادی و مساوات اور ان کے حقوق کی حمایت میں یہ کتاب لکھی تھی، اس مین اخلاقی، مدنی، تاریخی، معاشرتی اور طبی مختلف پہلوؤں سے بحث کرکے دکھایا ہی، کہ عورتین کسی صلاحیت میں مردون سے کم نہیں ہیں، انھیں ان کے حقوق اور آزادی سے محروم رکھنا نہ صرف اس جنس پر ظلم ہے، بلکہ اخلاق، تمدن، شرافت تہذیب و معاشرت اور ازدواجی زندگی کے ساتھ دشمنی ہے، عورتوں کی آزادی کے خلاف جو اعتراضات اور دلائل پیش کئے جاتے تھے، ان سب کا رد بھی ہے، خالص مشرقی نقطہ نظر سے مصنف کے تمام خیالات قابلِ قبول نہیں ہیں، لیکن اپنے دعووں کو بڑے فلسفیانہ استدلال سے پیش کیا ہے، بعض مقامات پر مذہبِ اسلام سے مصنف کی ناواقفیت ظاہر ہوتی ہے، لائق مترجم نے حاشیہ میں ان کی تردید کردی ہے، کسی فلسفیانہ کتاب کا ترجمہ کرنا بڑا دشوار کام ہے، لیکن لائق مترجم نے ایسا سلیس، شستہ اور سنجھا ہوا ترجمہ کیا ہی، کہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا،

کلیاتِ اسمٰعیل

مرتبہ جناب محمد اسلم صاحب سیفی تقطیع بڑی ضخامت تقریباً ۷۰۰ صفحے کاغذ کتابت طباعت بہتر قیمت مجلد للعہ پتہ، مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

مولوی اسمٰعیل صاحب میرٹھی مرحوم کا کلام تعارف و تبصرہ سے مستغنی ہی، وہ اردو شاعری کے مجددین میں تھے، ان کے صاحبزادے محمد اسلم صاحب سیفی نے ان کی زندگی ہی میں ۱۹۱۱ء مین ان کا کلیات مرتب کرکے شائع کیا تھا، اب اٹھائیس برس کے بعد دوسرا اڈیشن شائع کیا ہے، یہ پہلے سے زیادہ جامع ہی،

پہلی اشاعت کے وقت جو کلام کلیات میں شامل ہونے سے رہ گیا تھا، یا بعد کو کہا گیا، وہ بھی اس مین ہے، اس اڈیشن میں مرتب نے مصنف کے سوانح حیات کا بھی اضافہ کیا ہی، جس مین خاندانی حالات پیدائش سے وفات تک کے سوانح، علمی، ادبی، تعلیمی اور قومی خدمات تصانیف و تالیفات کی تفصیل اور مصنف کی شاعری کی تاریخ، اسکی خصوصیات، ہر دور کے تغیرات، اور اس عہد کی تصانیف پر تبصرہ ہے، سوانح کا حصہ مفید اضافہ ہے، اس سے مصنف کے حالاتِ زندگی کے ساتھ اس دور کے اور بہت سے مفید اور دلچسپ حالات معلوم ہوتے ہیں، یہ کلیات یون بھی ہر لحاظ سے قدر دانی کا مستحق تھا، مرتب نے اسکی آمدنی کو "محمد اسمٰعیل گرلز اسکول" پر وقف کرکے اسکی خریداری کو ہم خرما و ہم ثواب بنا دیا ہے،

قتیل اور غالب

مؤلفہ جناب سید اسد علی صاحب انوری فریدآبادی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۳۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۸ر، پتہ:- مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

غالب اور قتیل کے حامیوں کی ادبی معرکہ آرائی، غالب کے دور کا مشہور واقعہ ہے، سید اسد علی صاحب نے اس کتاب میں اسکی تاریخ اور قتیل پر غالب کے اعتراضات کی غلطیوں اور اپنے نقطہ نظر سے ان کی غلط بیانیون، افترا پردازیون، اور خود ان کے کلام کی غلطیون اور خامیون اور ان کی تحریرون سے ان کی اخلاقی کمزوریون کو دکھایا ہے، اگر مؤلف نے اس بحث کو اس کے دائرہ تک محدود رکھا ہوتا، تو خیر کسی حد تک یہ ادبی خدمت یا کم از کم ادبی تفریح ضرور ہوتی، لیکن اس میں غالب کی ذاتیات اور ان کی برائیون اور اخلاقی کمزوریون کو شامل کرکے اسے بدنما بنا دیا ہے، اگر ان واقعات کو صحیح مان بھی لیا جائے، جو خود ایک بحث طلب امر ہے، تو اس سے اس بحث کو کیا تعلق، بغیر اس کے مؤلف کی بحث زیادہ باوقعت ہوتی، البتہ اس کتاب نے غالب سے متعلق ایک نئے موضوع کا دروازہ کھول دیا ہے،

پھول والوں کی سیر

مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۵۴ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مرقوم نہیں، پتہ کتب خانہ علم و ادب دہلی،

دلی مرحوم کے تفریحی میلون مین پھول والوں کا میلہ خاص چیز تھی، جس میں عوام و خواص سب شریک رہتے تھے، جن چیزوں سے دلی عبارت تھی، ان میں ایک پھول والوں کا میلہ بھی تھا، مرزا غالب نے دلی کی تباہی کے سلسلہ میں پھول والوں کے میلہ کا بھی ماتم کیا ہے، اس میلہ مین بہادر شاہ اور شاہی بیگمات بھی شریک ہوتی تھیں، بلکہ انہی کی شرکت سے جان پڑتی تھی، شاہی بیگمات امریوں میں ساون مناتی تھیں، مرزا فرحت اللہ بیگ کے جادو نگار قلم نے دلّی کے آخری مشاعرہ کی طرح پھول والوں کی سیر کی بھی پوری تصویر دکھا دی ہے، کتاب نہایت دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہے،

مختار دلھن مؤلفہ محمد مرزا صاحب دہلوی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۹۶ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۸ر، پتہ کامران بک ڈپو دریا گنج، دہلی،

اس کتاب میں مؤلف نے شادی بیاہ کے برُے مراسم، عورتوں کی جہالت کے نتائج، ان کی صحیح تعلیم و تربیت وغیرہ، ہماری معاشرت کے بعض قابلِ اصلاح پہلوؤں کو صحیح اور معتدل نقطۂ نظر سے افسانے کی شکل میں پیش کیا، زبان نہایت ستھری ہے، کتاب دلچسپ اور عورتون کے لئے مفید ہے،

عروس سخن مرتبہ بیگم رضا صاحبہ، تقطیع بڑی، ضخامت ۲۰۵ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت ... قیمت مجلد عہ، پتہ نظامی پریس بدایوں،

میر انیس کے مرثیوں کے متعدد انتخابات شائع ہو چکے ہیں، بیگم رضا نے زنانی مجلسوں میں پڑھنے کے گیارہ مرثیوں سے یہ انتخاب کیا ہے، لیکن بیان کا سلسلہ نہیں ٹوٹنے پایا ہے، اس انتخاب میں عورتون کی زبان اور ان کے ذوق اور جذبات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے،

(م)